اگست 54ء

رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۳۰

ذیقعدہ ۱۳۷۳ھ
جلد ۴۲ عدد ۵

ماہنامہ

# ترجمان القرآن

مرتبہ

نعیم صدیقی

جاری کردہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"
۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ — لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے
قیمت فی پرچہ دس آنے

# پوتے کی وراثت کا
# مسئلہ

کچھ مدت سے ہمارے ملک میں اسلامی فقہ کے خلاف یہ شور برپا تھا
کہ وہ وراثت کے معاملے میں یتیم پوتوں کے ساتھ انصاف نہیں کرتی ان شور
مچانے والوں میں پیش پیش وہ لوگ ہیں جنہیں پوتے کی وراثت کے مسئلہ سے
کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے بلکہ وہ اس مسئلہ کی آڑ میں اور یتیم پوتے
کی مظلومی کا نام لے لیکر یہ ساری دھائی اس لئے مچارہے ہیں کہ اس طرح
درحقیقت وہ حدیث و فقہ کے اس تمام ذخیرہ کو جو پچھلی ساڑھے تیرہ صدیوں
میں فراہم ہوا ہے محض ایک دفتر بے معنی قرار دینا چاہتے ہیں اور اس کی
بنیاد پر تمام اسلامی روایات و قوانین سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ اس
مسئلے کا انتخاب خاص طور پر اسی لئے کیا گیا کہ ایک طرف تو یتیم پوتے کی
محرومی کا نقشہ کھینچکر عوام کے جذبات سے اپیل کرنا آسان وکارگر ہے اور
دوسری طرف یہ منجملہ ان مسائل کے ہے جن پر تمام علمائے اسلام متفق
ہیں خواہ وہ کسی مسلک اور کسی فقہ کے پیرو ہوں اور اگر ایک مرتبہ عام
لوگوں کے یہ ذہن نشین کرادیا جائے کہ تمام جلیل القدر صحابہ اور سارے
ائمہ مجتہدین جنمیں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل،
امام غزالی، امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ جیسے لوگ شامل ہیں یہ سب کے سب
"جاہل ملا" تھے کہ وراثت کے ایک معمولی سے مسئلے میں قرآن کی رہنمائی
کو ٹھیک نہ سمجھ سکے تو پھر بہت آسانی سے پورے ذخیرہ حدیث و فقہ
اور تفسیر و تعبیر کو ان کی نظروں میں بے وقعت ٹھہرایا جاسکے گا اور ان نئے
مجتہدین کے لئے راستہ صاف ہوجائے گا جو نبی صلی اللہ علیہ و سلم کے لائے ہوئے
اسلام کو ادھیڑ کر نئے سرے سے اپنے ڈیزائن اور اپنی تراش خراش کا ایک
اسلام تیار کرنا چاہتے ہیں

## پوتے کی وراثت کے مسئلے پر

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان کا یہ پمفلٹ اس مہم کے اصل پس منظر
کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ نفس مسئلہ کی حقیقت کو پوری طرح واضح
کرتا ہے اور تفصیل کے ساتھ ان دلائل کو پیش کرتا ہے جن کی بنیاد پر
علماء امت نے پوتے کے حق وراثت کو تسلیم نہیں کیا۔ قیمت چھ آنے

ملنے کا پتہ

**مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ۔ لاہور**

ترجمان القرآن لاہور

# فہرست مضامین

| عدد ۵ | ذیقعدہ ۱۳۷۳ھ - مطابق اگست ۱۹۵۴ء | جلد ۴۲ |
|---|---|---|



ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن۔
اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

# اِشارات

اس مرتبہ چند مختلف، مگر نہایت درجہ اہم مسائل تقاضا کرتے ہیں کہ ان اوراق میں اُن پر سنجیدگی سے اظہارِ خیال کیا جائے۔

(۱)

تازہ ترین حادثہ جس نے پورے ملک میں ایک فوری جذباتی ہیجان پیدا کر دیا ہے، بھارت کی حکومت کا یہ افسوسناک اقدام ہے کہ اُس نے دریائے ستلج کے پانی کی بہت بڑی مقدار بھاکڑا ننگل کے سلسلۂ انہار میں منتقل کر لی ہے۔

پاکستان کی نہریں دریائے ستلج سے معمولاً جس مقدار میں پانی لے رہی تھیں وہ ۲۸ ہزار کیوسک سے لے کر ایک لاکھ کیوسک تک گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ یکم جولائی کو بھارت کے جارحانہ تصرف کی وجہ سے یہ مقدار ۲۲ ہزار کیوسک تک آ گری، اور اب ۸ جولائی کو وہ کایک گھٹ کر ۹ ہزار ۸ سو کیوسک رہ گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا سات ہزار میل لمبا سلسلۂ انہار بے آب ہو کر رہ گیا ہے جس پر منٹگمری، ملتان اور ریاست بہاولپور کی زمینوں کی زرخیزی کا انحصار تھا۔ تقریباً اسی لاکھ ایکڑ کا وہ علاقہ جو غلے اور کپاس کی پیداوار کے لحاظ سے پاکستان میں درجۂ اول پر تھا ایک بے آب و گیاہ صحرا میں بدلنے والا ہے۔ اور ہمارے پچاس لاکھ بھائی ہیں جنہیں بے روزگاری اور بھوک کے سامنے لا کھڑا کر دیا گیا ہے علاوہ بریں پاکستان کی غلہ کی پیداوار ضرورت کے مقابلے میں جو کمی دکھا رہی تھی اس میں خوفناک اضافہ ہونا بالکل نمایاں ہے۔ واضح رہے کہ معاہدۂ تقسیم کے تحت واجبات اور املاک کا جو بٹوارا ہوا تھا اس میں پاکستان پنجاب کی نہروں کا حساب مجرا دے چکا ہے۔ گویا بھارت نے نہروں کی قیمت بھی وصول کر لی، اور اب پانی بھی اُڑس لیا۔

بین الاقوامی قانون اور روایات کے لحاظ سے اس طرح کے اقدامات اعلانِ جنگ کے مترادف قرار پاتے ہیں۔ اس طرح کے تصرفات کو کوئی مضبوط ملک برداشت نہیں کرسکتا اور کسی سرزمین کے شہری ایسی دراز دستیوں کو چپ چاپ گوارا نہیں کرسکتے۔ تقسیم کے بعد بھارت کی طرف سے حیدر آباد، جوناگڑھ اور کشمیر کے معاملے میں پے در پے جو زیادتیاں ہوئی ہیں ان سب کے بعد یہ بہت بڑی کاری ضرب ہے جو پاکستان کی اقتصادی زندگی پر لگائی گئی ہے۔ یہ صریحاً ایک محاربانہ اقدام ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ بھارت کی حکومت بھاکرا اسکیم سے فائدہ اٹھانے سے زیادہ پاکستان کو نقصان پہنچانا پیش نظر رکھتی ہے۔

یہ تلوار بہت دنوں سے ہمارے سروں پر لٹکی ہوئی تھی[1] لیکن ہمارے امن پسند لیڈروں کا اندازہ یہ تھا کہ چونکہ معاملہ ورلڈ بنک کی کمیٹی کے سامنے ثالثی اور سمجھوتے کے لیے جاچکا ہے اس لیے دیر سویر کسی طرح کا معاہدہ طے پاجائے گا اور خطرہ اتنے عرصہ کے لیے معلق ہوجائے گا کہ بیچ کے وقفے میں دوسری اسکیموں کو عمل میں لاکر پانی کی کمی کو پورا کیا جاسکے۔ مگر بھارت کی حکومت ایسی امن پسند کبھی نہ تھی کہ وہ ثالثی اور سمجھوتے کی کوششوں کے نتائج کا انتظار کرتی، اس نے انتہائی جسارت سے کام لے کر ستلج کا سارا پانی کاٹ لیا ہے۔ حالانکہ ابھی ہمارے اور بھارت کے نمائندے نیویارک میں غور و خوض کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کے آخری فیصلے سے قبل بھارت کی حکومت ۱۹۵۲ء کے عارضی معاہدے کی پابند ہے۔ دنیا کو پنڈت نہرو کے اس خلافِ واقعہ اعلان نے حیرت میں ڈال دیا ہے کہ چونکہ ورلڈ بنک کی معرفت ہونے والی گفتگو ناکام ہوچکی ہے اس لیے اب بھارت اپنی اسکیم پر عمل پیرا ہونے کے لیے آزاد ہے۔ اس بیان کی تردید خود ورلڈ بنک کی طرف سے کردی گئی ہے، لیکن بھارت اس کی پروا کیے بغیر ۵۲ء کے معاہدے کو پھاند چکا ہے۔

افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ ورلڈ بنک کی جس کمیٹی سے منصفانہ ثالثی کی توقعات وابستہ کی

[1] درحقیقت اس مصیبتِ عظمیٰ کے بیج خود تقسیم کے فیصلے میں بو دیے گئے تھے اور ایک اہلِ قیادت کو بجوا کے اندر ہی درحقیقت دیکھ لینے چاہیے تھے، لیکن ۱۹۴۸ء میں آکر تو یہ بیج باقاعدہ کونپلیں نکال چکے تھے آخر یہ سارا زمانہ کیسے بیکار گیا۔

گئی تھیں اُس نے ان ساری توقعات کے خلاف ایسی صورتیں اختیار کی ہیں کہ بھارت کی پوزیشن کو بے جا سہارا مل گیا ہے۔ مثلاً :-

——— پاکستان کے سامنے ستلج، بیاس اور راوی کے پانی کا مسئلہ تھا، لیکن ورلڈ بنک کمیٹی نے چناب، جہلم اور اٹک کے دریاؤں کے پانی کو بھی اسی میں شامل کرنے کے لیے مسئلے کو "دریائے سندھ کے طاس کا آبی تنازعہ" کا عنوان دے دیا۔ اس طرح تنازعہ کی حدود وسیع تر ہو گئیں۔

——— کمیٹی نے اپنی تجاویز اس رائے پر استوار کی ہیں کہ ستلج، بیاس اور راوی کا پانی اگر انڈیا لے تو اس کمی کو پاکستان چناب، جہلم اور اٹک کے فالتو پانی سے پورا کر سکتا ہے۔ حالانکہ ان دریاؤں کا پانی اس وقت بھی پورے زمانہ ربیع میں اور خریف کے بعض حصوں میں بالکل ناکافی ہوتا ہے اور بمشکل اس کی کمی دوسرے دریاؤں سے پورا کیا جاتا ہے۔ یہ خلاف واقعہ رائے بھی پاکستان کے خلاف پڑی ہے۔

——— کمیٹی نے راجستھان کے بھارتی علاقے کو دریائے سندھ کے طاس سے متعلق قرار دے دیا ہے، حالانکہ فی الحقیقت اس کی آبپاشی گنگا اور جمنا سے بآسانی کی جا سکتی ہے۔ یہ چیز بھی انڈیا کے حق میں گئی ہے۔

——— گفت وشنید کے طے شدہ خطوط میں یہ بات شامل تھی کہ تنازعہ کو سیاسی زاویۂ نظر سے نہیں، بلکہ انجینئرنگ کے لحاظ سے دیکھا جائے گا، لیکن کمیٹی نے خود ہی انجینئرنگ کے معیار کو ترک کر کے سیاسی طرزِ فکر اختیار کر لیا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہماری پرانی تاریخی نہروں کا پانی انڈیا کو تو تعمیر نہری سلسلے کے لیے لینے کا حق دیا جا رہا ہے اور دوسری طرف پاکستان کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ کئی کروڑ کی لاگت اور کئی سال کی محنت سے باہم دگر مربوط بندوں کا ایک وسیع سلسلہ تعمیر کرے، درآنحالیکہ ان بندوں کے سلسلہ کا آغاز کشمیر کے اس علاقے ہی سے ہو سکتا ہے جو بھارت کے قبضے میں ہے۔

——— طے پایا تھا کہ پانی کی تقسیم کا تناسب دونوں ملکوں کے اُن زیر کاشت رقبوں کے تناسب سے ہوگا جو دریائے سندھ کے طاس کی حدود میں آتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھارت کے حصے

میں پانی کی جملہ مقدار کا ۳۰ فیصد آتا ہے، لیکن اسے کمیٹی ۲۰ فیصد پانی لینے کا استحقاق دے رہی ہے۔ ——— اب بنک کی طرف سے بیان دیا گیا ہے کہ ستلج سے بھارت کے پانی لے لینے کے نتیجے میں پاکستان کو دو ماہ تک کوئی خاص نقصان نہیں پہنچ سکتا، لہٰذا کوئی فوری خطرہ نہیں ہے۔ گویا پاکستان کی رائے عام اور بین الاقوامی ماحول کو مطلئن کیا جا رہا ہے۔

اس ڈھنگ کی ثالثی نے معاملہ یہاں لا پہنچایا ہے کہ پاکستان کے میلوں لمبے علاقے میں فصلوں کو تو درکنار، آدمیوں تک کو پینے کا پانی مشکل سے ملے گا۔

اب ملک میں اضطراب کی ایک لہر اس سرے سے اُس سرے تک دوڑ گئی ہے۔ مگر اس اضطراب سے نکلنے کی راہ کیا ہے؟ کیا ایک یوم ماتم؟ ایک احتجاج؟ لیڈروں کے چند جوشیلے بیانات؟ اخبارات کے تند و تیز نوٹ؟ پارلیمنٹ میں اس موضوع پر ایک گرما گرم بحث؟ کابینہ کے خفیہ اجلاسوں میں غور و خوض اور پیہم غور و خوض؟ ——— اور پھر پھر کر وہی ثالثی، وہی دہائی، وہی استغاثہ؟ یا کچھ اور؟

ہم مانتے ہیں کہ جھگڑوں کو نمٹانے کے لیے گفت و شنید اگر کارگر ہو سکے اور ثالثی اگر موثر ثابت ہو تو اس سے زیادہ پسندیدہ تدبیر اور کوئی نہیں۔ لیکن تجربہ گواہ ہے کہ گفت و شنید اور ثالثی کا معرکہ میز پر بھی وہی لوگ جیتتے ہیں جو اپنے پیچھے مضبوط قوت رکھتے ہوں اور جو اگر ایک مرتبہ "ورنہ ــــ" کا لفظ زبان پر لائیں تو فضا جھرجھری لے لے۔ واعدوا لھم ما استطعتم کا منشا یہی نہ تھا کہ بات بات پر لڑائی چھیڑی جائے بلکہ یہ بھی تھا کہ یہ حالت پُرامن تدابیر اور مصالحانہ مساعی کی کامیابی کے لیے بھی لازم ہوتی ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہماری قوت بازو کم نہیں ہے، بلکہ اتنی مضبوط ہے کہ اس پر خدا کا شکر ادا کیا جائے۔ لیکن اسے مضبوط تر بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمارے لیڈر داخلی جوڑ توڑ اور سازشوں سے بالاتر ہو کر اجتماعی مفاد کی مخلصانہ خدمت پر کمربستہ ہوں، وہ جمہور کو اسلامی شعور اور جذبہ سے لا بال کریں، وہ رائے عام کو ایک ایک مسئلے میں ٹھکراتے چلے جانے کے بجائے اسے گلے لگائیں، اور ہر اختلاف کرنے والے کے خلاف تشدد کے ہتھیار لے کر ملکی سیاست کے میدان میں اتر آنے کی کمزوری

کو ترک کر دیں۔ یہ تبدیلیاں پوری قوم کو بھی، اور خود ہمارے معاملات کی باگ ڈور ہاتھ میں لینے والے اکابر کو بھی حریف قوتوں کے مقابلے میں قوی بنائیں گی۔ ورنہ اگر بڑے لوگ آپس میں بھی کھینچا تانی میں مصروف ہوں، رائے عام کو بھی کچلے دے رہے ہوں، اپنے ملک کی منظم اور کام آنے والی طاقتوں کو اختلاف کی سزا دینے میں مصروف ہوں تو قوم ہی کمزور نہیں ہوتی، بڑے لوگ خود بھی کمزور ہو جاتے ہیں، اور کمزوری جس طرح جنگ کے میدان میں خطرناک ہوتی ہے، گفت و شنید کی مجالس میں بھی ویسی ہی خطرناک ہوتی ہے۔ ان پہلوؤں سے گذشتہ سات برس میں جو کوتاہیاں ہوتی رہی ہیں، یہ انہی کا نتیجہ ہے کہ بھارت کی حکومت ہمارے خلاف نت نئے جارحانہ اقدامات کر رہی ہے۔ اب بھی اگر ان کوتاہیوں کی تلافی کا فیصلہ کر لیا جائے تو ہارے ہوئے داؤں واپس جیتے جا سکتے ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ حکومت پاکستان کو بھارت کے ظلم سے بچانے کے لیے جو بھی موثر اقدام تجویز کرے گی، ملک کی تمام پارٹیاں اور عناصر اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اس کا ساتھ دیں گے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سب کو اعتماد میں لے کر کوئی قدم اٹھایا جائے۔ یہ معاملات اب تنہا مسلم لیگ کے بس کا روگ نہیں رہے۔

---

(۲)

مولانا مودودی کے بارے میں حکومت کا پُر اسرار سکوت تا دمِ تحریر جاری ہے۔

مارشل لاء کے قیدیوں کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے ایبٹ آباد کے جلسے میں امیر جماعت نے فرمایا تھا کہ حکومت کے سامنے قابلِ عمل صورتیں صرف تین تھیں:۔

ایک یہ کہ مارشل لاء کے سارے کے سارے قیدیوں کو اس دور کے گذرتے ہی فوراً چھوڑ دیا جاتا۔ یہ صورت دنیا بھر کی مسلّمہ اور زیرِ عمل روایات کے مطابق ہوتی۔ مارشل لاء کے ہنگامی دور میں غیر معمولی نوعیت کی سخت کارروائیاں لمبی چوڑی تحقیق کے بغیر عمل میں لائی جاتی ہیں اور بہرا معلوم افراد ان کی لپیٹ میں آجاتے ہیں، اور چونکہ ان کارروائیوں کا اصل مقصد نظم و قانون کو از سر نو استوار کر کے حالت امن

پیدا کر دینا ہوتا ہے، انتقام و تعزیر کا محرک ان میں شامل نہیں ہونے دیا جاتا، اس لیے دنیا کی مہذب حکومتیں مارشل لاء اٹھتے ہی اس کی سزاؤں کو ختم کر دیتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ تمام سزاؤں کو جاری رکھا جاتا۔ یہ صورت اگرچہ جمہوری ممالک کی روایات کے بالکل خلاف ہوتی اور اپنی حکومت کے ہاتھوں اپنی ہی رعایا کے خلاف یہ طرزِ معاملہ ظالمانہ ہوتا تاہم حکومت اپنے وقار (PRESTIGE) کی خاطر ایسا کرتی تو کہا جا سکتا تھا کہ یہ ایک طے شدہ ہمہ گیر پالیسی ہے چاہے وہ کتنی ہی گھٹیا نوعیت کی کیوں نہ ہو۔

تیسرے یہ کہ سزا یافتگان کو حق دیا جاتا کہ وہ ملکی عدلیہ کے سامنے اپیل لے جائیں۔ اس طرح باقاعدہ عدالتی تحقیقات عمل میں آتی اور عام قانون کے تحت جن کے خلاف جرائم ثابت ہو جاتے ان کے لیے معتدل درجے کی سزائیں نافذ ہوتیں اور جن کا مجرم ہونا ثابت نہ ہو سکتا ان کو بری کر دیا جاتا۔ اس صورت میں کہا جا سکتا تھا کہ حکومت صرف انصاف کرنا چاہتی ہے اور قانون کے وقار کو مستحکم بنانا چاہتی ہے

لیکن حکومت نے ان تینوں جائز اور معقول صورتوں کو چھوڑ کر دنیا بھر سے نرالی ایک چوتھی راہ نکالی وہ یہ کہ پہلے تو انڈمنٹی ایکٹ کے ذریعے مارشل لاء کی تمام سزاؤں کو قانونی حیثیت سے مستقل بنا دیا پھر اسی ایکٹ میں یہ بات بھی رکھ دی کہ مارشل لاء کے سزا یافتگان اگر چاہیں تو مرکزی حکومت کو اپنی سزا کے خلاف عرضی پیش کر سکتے ہیں، ایسی کسی عرضی کے موصول ہونے پر حکومت شخص متعلقہ کا کیس بطور خود مرتب کر کے فیڈرل کورٹ کے ایک جج کے سامنے پیش کر دے گی۔ یہ ساری کارروائی سزا یافتگان کے علم سے بالا بالا ہی ہوگی اور وہ حکومت کے پیش کردہ کیس کو معلوم کر کے اس کی کوئی صفائی اصالتاً یا وکالتاً پیش نہیں کر سکیں گے، اس خفیہ طریقے سے جج کی رائے معلوم کرنے کے بعد حکومت اس رائے کے مطابق سزا کو بحال رکھ سکتی ہے، اس میں کمی کر سکتی ہے، یا اسے بالکل ختم کر سکتی ہے۔

سوچیے، کیا یہ صورت اسلام کے معیارِ عدل پر، یا کم سے کم موجودہ دنیا کے مسلمہ اصولِ انصاف پر کسی درجہ میں بھی پوری اترتی ہے؟

مگر اکتفا اسی پر نہیں کیا گیا کہ مارشل لاء کا جو قیدی عرضی دے اس کے معاملے کو زیرِ غور لایا جائے

اور جو نہ دے اس کو پڑا رہنے دیا جائے، نہیں، حکومت نے خود بھی یہ اختیار حاصل کر لیا کہ عرضی نہ دینے والے قیدیوں میں سے جس کا معاملہ بھی چاہے وہ بطور خود پیش کر دے گی۔

لیکن ایکٹ کے دیئے ہوئے اختیارات کی حد یہیں ختم نہیں ہو جاتی، مزید ایک دفعہ کے ذریعے حکومت اس کی مجاز ہے کہ وہ جسے چاہے بغیر اس کا کیس فیڈرل کورٹ کے کسی جج کے سامنے رکھے رہا کر دے۔

اب ایکٹ کی وہ مخصوص، پیچ در پیچ ساخت ہم نے مجملاً بیان کر دی ہے جس کے ہوتے ہوئے قانون کا تقاضا مسلم لیگی وزراء اور عمّال کے ذاتی اور گروہی اور سیاسی رجحانات کے تقاضوں میں بالکل حل ہو کے رہ جاتا ہے۔ یہی وہ ساخت تھی جس کو معیارِ عدل سے ہٹا ہوا پا کر مولانا مودودی نے اپنے معاملے پر نظرثانی کرانے کی درخواست دینے سے انکار کر دیا اور ساری عمر جیل میں گذار دینے کو اس پر ترجیح دی۔ بعد کے حالات نے واضح کر دیا کہ مولانا مودودی کا اندیشہ بالکل بجا تھا اور جس اصول پسندانہ مسلک کو موصوف نے اختیار کیا، وہی اختیار کیے جانے کے قابل تھا۔

اب یہ طرفہ ماجرا دیکھ لیجیے کہ ۵۳ء کے سارے ہنگامے میں اگر کوئی مجرم اور تشدد کا گنہ گار مسلم لیگی اقتدار کو ملا تو صرف مولانا مودودی کی ذات تھی، یا پھر عبدالستار خاں نیازی کی! کیسی دلچسپ صورت ہے کہ جن قادیانی حضرات کو مارشل لاء کی عدالتوں سے سزائیں دی گئیں وہ تو چند روز کے اندر اندر آناً فاناً جیل سے باہر آ گئے، اور بعد میں آہستہ آہستہ مجلس عمل کے ارکان اور تحریکِ راست اقدام کے لیڈر اور سرگرم کارکن حتیٰ کہ تشدد کی کارروائیوں کے الزام میں سزائیں پانے والے بھی تمام کے تمام رہا ہو گئے۔ اب قانون اور انصاف کا سارا تقاضا پورا کرنے کے لیے، اور حکومت کی دھاک باندھے رکھنے کے لیے اور فوج کے وقار کی بحالی کے لیے مولانا مودودی اور خان نیازی ہی تختۂ مشق بننے کو باقی رہ گئے ہیں۔

واضح رہے کہ اس سلسلے میں مارشل لاء، اس کی نوعیت، اس کے تحت مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے کارکنوں کی گرفتاری اور املاک اور حسابات پر ہاتھ صاف کرنے کے واقعات، فوجی عدالت کے مقدمے کی کارروائی کی تفصیل، آنڈیننٹی ایکٹ کی مخصوص ساخت اور شروع سے اب تک کی حکومت کی پالیسی کے خم و پیچ اس ملک کے عوام پر پوری پوری طرح واضح ہو چکے ہیں جس کا سب سے بڑا ثبوت

یہ ہے کہ رائے عام ——— اور ہر طبقے اور ہر عنصر کی رائے عام ——— نے ایک ایک مرحلے میں ملک گیر پیمانے پر اپنے تاثر کا اظہار احتجاج کی صورت میں کیا ہے۔ جلسے، قرار دادیں، تار، محضر نامے، وفود، مظاہرے، اخبارات کے نوٹ، مساجد کی دعائیں، ہر طرف سے ایک سیلاب کی طرح امڈتی رہی ہیں اور سنجیدہ، باوقار، پُرامن اور جمہوری تدابیر جو بھی ممکن العمل تھیں ان میں سے بیشتر کے ذریعے پاکستان کے شہریوں نے اپنے جذبات مولانا مودودی کے معاملے میں سینہ کھول کر حکمراں طبقے کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ دلیل کے میدان میں مسلم لیگی اکابر کی پالیسی پوری طرح شکست کھا چکی ہے۔ آج آپ کسی کوردہ میں چلے جائیے اور کسی اَن پڑھ غیر سیاسی دیہاتی بڈھے کو ہل چلاتے ہوئے روک لیجیے، کسی بچے کو مٹی کے گھروندے بناتے ہوئے پکاریئے، کسی عورت کو دودھ بلوتے ہوئے جا کر پوچھیے کہ مولانا مودودی کے معاملے میں حکومت کا رویہ انصاف کا رویہ ہے یا زیادتی کا؟ ——— اس کے جواب میں آپ صرف "ظلم! ظلم!!" کی ایک ہی آواز ہر کسی سے سنیں گے۔ آپ مزید کریدیئے تو اس ملک کا عامی آدمی بھی آپ کو بتا دے گا کہ مولانا مودودی کا قصور اسلامی دستور کی تحریک چلانا ہے۔ یوں نہیں، تو پھر ہم چیلنج کرتے ہیں کہ آپ کے چوٹی کے لوگ کسی شہر کسی علاقے میں آئیں اور ایک جلسۂ عام بلا کر مولانا مودودی کے خلاف اپنا کیس پیش کریں اور جماعتِ اسلامی کے کسی معمولی کارکن کو جوابی تقریر کا موقع دیں، پھر وہ رائے شماری کر لیں کہ لوگ کس کے دلائل کو وزن دیتے ہیں۔ بلکہ جوابی تقریر کا موقع اگر نہ بھی دیا جائے تو بھی ہمارا اندازہ یہ ہے کہ لوگ اپنے فہم و شعور سے صحیح نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں۔

اب آگے صرف دھاندلی کا میدان باقی ہے۔ جن کے ہاتھوں میں اختیارات ہوتے ہیں وہ جب دلائل سے ہر طرف سے زچ ہو جاتا ہے تو قوت کے لٹھ کو حرکت میں لے آتا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہی لٹھ آپ کے چلانا ہے تو آپ کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں۔ چلا دیکھیے۔ مگر یقین جانیے کہ جس لٹھ کی حرکت دلائل کی بنا پر اپنا جواز عوام کے سامنے ثابت نہ کر سکی ہو، اس کے وار سے چوٹ تو کسی مظلوم ہی کو لگتی ہے مگر اس چوٹ کا بہت زیادہ درد خود لٹھ چلانے والے کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ دلیل کی سرحد پار کرنے کے بعد سیاسی انتقام کا میدان سامنے آجاتا ہے، اور سیاسی انتقام کو کتنی ہی مقدس نقابیں اڑھا دیجیے، دنیا کی نگاہ اس کے اندازِ قد کو بخوبی پہچانتی ہے۔

مولانا مودودی کے خلاف آپ جو چاہیں کیجئے، لیکن ایک بار پھر یہ حقیقت سمجھ لیجیے کہ مولانا مودودی ہے کون؟

یہ وہ شخص ہے جس نے اس دورِ الحاد میں خالص عقلی اسلوب سے اسلام کے عقیدوں، اس کے اصولوں اس کے فلسفے، اس کے قوانین وضوابط، اس کی اخلاقی قدروں، اس کی تہذیبی روایات اور اس کے آداب وشعائر کو نکھار کر پیش کیا ہے۔ اس نے اسلام کو جامد مذہب کی سطح سے اٹھا کر اجتماعی دین اور انقلابی تحریک کی صورت میں اجاگر کر دیا ہے جس نے متزلزل ایمانوں کو از سر نو مستحکم کر دیا ہے، اس نے اکھڑے ہوئے دلوں کو دوبارہ جما دیا ہے، اس نے الجھے ہوئے دماغوں کی ساری گرہیں کھول دی ہیں۔ اس نے نئی امنگیں اور نئے جذبات دیئے ہیں۔ اس نے زندگی کے یخ بستہ سمندر میں حرکت پیدا کی ہے۔

ہاں! یہ وہ شخص ہے جس کا پیغام ہزاروں دلوں میں اس طرح اُتر گیا ہے کہ اس نے زندگیوں میں انقلاب پیدا کر دیا ہے، لوگوں کے دل و دماغ بدل گئے ہیں، لوگوں کے اخلاق کی کایا پلٹ گئی ہے، لوگوں کی دوستیوں اور دشمنیوں کی سمتیں تبدیل ہو گئی ہیں، گھروں کے گھر ہیں کہ جن کی تہذیب اور جن کا کلچر نئے سانچوں میں ڈھل گیا ہے۔ نوجوان ہیں جو کل تک خدا اور مذہب کا مذاق اڑاتے تھے، لیکن آج اسی خدا کے جان نثار بندے اور اس کے مذہب کے اصولوں کے لیے دن رات جانفشانیاں کرنے والے ہیں۔ اچھے دل ودماغ جو کل تک کمیونزم کے علمبردار تھے آج اسی کے خلاف معرکہ آرائی میں پیش پیش ہیں۔ خواتین ہیں کہ جن کی حیثیت نظر اگر کل تک مغربی طرز کی زندگی تھی تو آج ان شمع ہائے خانہ کی کرنوں سے کتنے ہی خاندانوں میں اسلامی ماحول پیدا ہو رہا ہے۔ طلباء ہیں کہ جنہیں آپس کی دھڑے بندیوں اور سیاسی لیڈروں کے اشاروں پر ہنگامہ آرائیوں سے فرصت نہ ملتی تھی، آج اپنے آپ کو ایک اسلامی نظام کے کل پرزے بنانے کے لیے ذہنی و اخلاقی تیاری میں مصروف ہیں! ادیب ہیں کہ جو کل تک دولت اور شہرت کی طلب میں اخلاق سوز تفریحی نگارشات کی تخلیق میں دماغی قوتیں کو برباد کر رہے تھے، آج ان کے قلم خدا و رسول کی امانت بن گئے ہیں۔ تاجر اور وکیل بدلے ہیں، سرمایہ دار اور مزدور بدلے ہیں زمیندار اور کسان بدلے ہیں، عالم اور ان پڑھ بدلے ہیں، شہری اور دیہاتی بدلے ہیں —— اور آئے دن اس شخص کی دعوت یہ انقلابی عمل دکھا رہی ہے۔

ہاں! یہ وہ شخص ہے جو ایک کتابی اور خطابتی پیغام دے کر ہی نہیں رہ گیا۔ اس نے دین کے لیے ایک تحریک برپا کر دی ہے۔ اس نے ایک تنظیمی طاقت پیدا کر دی ہے۔ اس نے سیاست کے اطوار کو نیا رنگ دیا ہے۔ اس نے اجتماعات اور جلسوں کو نئی فضا دی ہے۔ اس نے تقریروں کو نیا مزاج دیا ہے۔ اس نے انتخابات کے لیے اسلامی اصولوں پر ایک نئی پالیسی مرتب کر کے تجربے کے میدان میں ڈال دی ہے۔

ہاں! یہ وہ شخص ہے جو ایک بے داغ سیرت کا مالک ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ دنیا سے مخفی نہیں، نہ اسے کسی گوشے کو مخفی رکھنے کی کبھی ضرورت ہی پیش آتی ہے۔ وہ نہ کسی قیمت پر بکنے والا ہے اور نہ کسی ڈراوے سے ڈرنے والا ہے۔ وہ عیارانہ جوڑ توڑ سے منزلوں بلند ہے۔ وہ مفاد کی بازیاں کھیلنے سے کوسوں دور ہے۔ وہ اغراض کے مُہرے لڑانے سے کاملاً پاک دامن ہے۔ اسے آپ نے مختلف الزامات کا ہدف بنایا مگر کوئی الزام اس کے قامت پر راست نہ بیٹھا، آپ لوگوں نے اس کے خلاف شبہات پھیلائے مگر اس کی سیرت پر کوئی شبہ چپک نہ سکا، آپ نے گالیاں دیں لیکن کوئی گالی اس پر پھب نہ سکی۔ آپ نے اسے ابتلاء کی انتہائی کٹھن وادیوں سے گذارا مگر کہیں اس نے ہمت نہیں ہاری۔ آپ نے اسے گرم ترین بھٹیوں میں ڈالا مگر وہ ہر بار زرِ خالص بن کر نکلا۔

ہاں! یہ وہ شخص ہے کہ لوگ جس کی علمی رفعت سے مرعوب ہی نہیں، اس کے کیرکٹر سے متاثر بھی ہیں۔ صرف متاثر ہی نہیں، اس کے احسان مند بھی ہیں۔ احسان مندی کا صرف اعتراف ہی نہیں کرتے، اس سے گہری محبت بھی کرتے ہیں۔ اور اس سے محبت کرنے والوں کا حلقہ پاکستان تک ہی محدود نہیں، تمام مسلم ممالک بلکہ یورپ کے بڑے بڑے شہروں تک بھی پھیلا ہوا ہے۔

ہاں! یہ وہ شخص ہے جس کا لٹریچر گھر گھر میں موجود ہے، جس کے ملنے والے شہر شہر میں پھیلے ہوئے ہیں، جس سے خط و کتابت کرنے والے گاؤں گاؤں میں موجود ہیں، جس کی فکر اجتماعی ذہن کے رگ و ریشہ میں اتر گئی ہے، جس کی اصطلاحات آج نادانستہ طور پر اس کے مخالفین کی تحریر و تقریر میں بھی گھل مل گئی ہیں۔

ایسے شخص کے "جرم" کو بھی لوگ جانتے ہیں، اس کے مخالفین اور اس کے حریفوں کے طرزِ معاملہ

کی حقیقت بھی لوگ سمجھتے ہیں، اور اس کو دی جانے والی سزا کے معنی بھی جانتے ہیں۔

ایک بار اچھی طرح سوچیے کہ ایسی بلند مرتبت تاریخی شخصیت کے نہ وقار کو آپ کم کر سکتے ہیں، نہ اس کی عزت گھٹا سکتے ہیں، نہ اس کی محبوبیت و مقبولیت کا دائرہ سکیڑ سکتے ہیں اور نہ اس کے پیغام کے جادو کو توڑ سکتے ہیں۔ اُس کے سامنے آپ کے طبقے میں سے کتنے ہی اکابر اُبھرے اور سال دو سال اپنے ٹمٹمانے دکھا کر زمانے کے حافظے کی بالکل نچلی تاریک تہوں میں جا ڈوبے لیکن مودودی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتا جا رہا ہے۔

یہ بھی سوچیئے کہ لوگ مولانا مودودی کی رہائی کا مطالبہ محض اس لیے نہیں کرتے کہ وہ ایک مذہبی یا سیاسی لیڈر ہے۔ بلکہ وہ اس کی ذات کو "اسلامی دستور"، "اسلامی تحریک" اور "اسلامی نظام" کا ایک نشان محسوس تسلیم کرتے ہیں۔ وہ مولانا مودودی کے الفاظ سے گوشت اور ہڈیوں کا ایک پیکر مراد نہیں لیتے بلکہ ان کا مفہوم ہوتا ہے "دین کو غالب کرنے کی جدوجہد"، ان کے تصور میں چمک اُٹھتے ہیں "اسلامی مملکت کے ۲۲ اصول"، ان کی آنکھوں کے سامنے نمودار ہو جاتا ہے "قادیانی مسئلہ"، ان کا تخیل دیکھنے لگتا ہے "تفہیم القرآن" کے اوراق کو!

یہ ہے مودودی!

اس کے ساتھ آپ کو جو کچھ کرنا ہے، ان ساری حقیقتوں کو خوب سمجھ کر کیجیے! آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کیوں جگہ جگہ سے مودودی کی سزا کے خلاف رائے عام کی چیخیں بلند ہو رہی ہیں، کیوں اتنا اضطراب پھیلا ہوا ہے، کیوں شہر شہر مظاہرے ہوتے ہیں اور کیوں جگہ جگہ لوگ آپ کا دامن تھام تھام کر پوچھنے لگے ہیں کہ مولانا مودودی کے ساتھ کیا سلوک روا رکھو گے۔

ان ہمہ گیر عوامی جذبات کو آپ نے پنجاب کے شہروں اور اضلاع میں دفعہ ۱۴۴ لگا کر، امیر جماعت کی زبان بندی کر کے اور تشدد کی مختلف تدبیریں عمل میں لا کر اپنی طرف سے دبا دیا ہو گا لیکن خیر خواہانہ گذارش یہ ہے کہ بے چینی اسی طرح لہریں لے رہی ہے اور جب مضطربانہ جذبات پر اظہار کے دروازے اوپری تدبیروں سے بند کر دیئے جائیں تو حالت وہی ہوتی ہے جیسے درد و کرب سے تڑپنے والے کسی مظلوم زخمی کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے جائیں۔ تشدد اس سے یہ سلوک کبھی اچھے نتائج نہیں دے سکتا!

(۳)

ہمارے ارباب اختیار قوم کے ایک ایسے عنصر سے تعلق رکھتے ہیں جسے ہر دعوت اور ہر تحریک کسی نہ کسی درجے میں گوارا ہو سکتی ہے، لیکن اسلامی نظام کی دعوت اور اسلامی تحریک کی پکار ٹھنڈے پیٹوں ہرگز ہرگز گوارا نہیں۔ وہ اس کے بارے میں شکوک و شبہات رکھتے ہیں، غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کے طومار اُن کے ذہنوں میں بھرے پڑے ہیں، اس دعوت کو بدنام کرنے والی اصطلاحات ان کی زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں، اس کے خلاف غیظ و غضب کا طوفان ہے جو دلوں میں اٹھتا رہتا ہے۔

آخر کیوں؟ محض اس لیے کہ یہ دعوت انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اُن سے ہمہ گیر تبدیلیوں کا مطالبہ کرتی ہے، یہ فکر و نظر کے پیمانے بدل دینا چاہتی ہے، یہ سیرت و کردار کی بنیادوں کو از سرِ نو قائم کرنا چاہتی ہے، یہ معاشرتی مرتبوں کی موجودہ غلط ترتیب کو تہ و بالا کرنے کا داعیہ رکھتی ہے، یہ حقوق و فرائض کی غیر منصفانہ تقسیم کو جوں کا توں برقرار نہیں رہنے دے سکتی۔ دوسری سطحی دعوتوں اور سیاسی جتھہ بندیوں میں صرف بولیاں بدلنی پڑتی ہیں، لیکن یہاں بولی کے ساتھ ساتھ زندگی بدلنی پڑتی ہے۔ ہمارے قومی بزرگ ایسے اسلام کو تو سر آنکھوں پر لینے کو تیار ہیں جس کے لیے صرف ایک نئی بولی بول دینے سے کام چل جائے، لیکن وہ اسلام جو عمل و کردار کا نقشہ بدلنے کا تقاضا بھی کرے اسے یہ پاکستان کے مفاد کے لیے ایک مہلک خطرہ تصور کرتے ہیں۔

جماعت اسلامی اسی عملی اور اجتماعی اسلام کی دعوت کو لے کر اٹھی ہے۔ اس کا یہی وہ قصور ہے جس کی گوناگوں سزائیں گذشتہ سات برس کے ایک ایک سیکنڈ میں اس نے بھگتی ہیں، اور ابھی بڑی بڑی دھمکیاں اس کے سامنے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی دعوت، اس کے کام اور اس کے پروگرام کے کسی جزو پر معقولیت اور استدلال، اور انصاف کے میدان میں کوئی کھلا کھلا حملہ کبھی ممکن نہیں ہوا۔ اس پر جتنے بھی وار ہوئے ہیں عقلی اور نقلی نوعیت کے ہیں۔ اس پر جب بھی کوئی دراندستی کی گئی ہے تو جھوٹے پروپیگنڈے اور غلط الزامات کی آڑ میں کی گئی ہے۔ آج تک جن الزامات کو یکے بعد دیگرے جماعت اسلامی پر تشدد کرنے کا بہانہ بنایا جاتا رہا ہے وہ علی الترتیب یہ ہیں:۔

—— چونکہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کا ساتھ نہیں دیا، لہٰذا یہ جماعت پاکستان کی وفادار نہیں ہو سکتی، اور اب اس کی ساری سرگرمیاں پاکستان دشمنی پر مبنی ہیں۔

—— اس جماعت نے جہادِ کشمیر کو حرام کہا اور اس کی مخالفت کی۔

—— اسے نہرو کی حکومت کی طرف سے روپیہ ملتا ہے۔

یہ ہتھیار دیر تک خوب خوب استعمال کیے گئے، لیکن آخر یہ کند ہو کر رہ گئے۔ اب نئے ہتھیاروں کی ضرورت پیش آئی تو فوقِ ایجاد رکھنے والوں نے ایک نیا شوشہ کھڑا کر دیا۔ یہ کہ جماعت اسلامی کو امریکہ سے روپیہ ملتا ہے۔ چنانچہ کارکنانِ مرکز کو شاہی قلعے میں لے جا کر کئی دن زیرِ تفتیش رکھا گیا اور حساب کتاب کے کاغذات کی خورد بینی پڑتال ہوتی رہی۔ لیکن جھوٹ آخر جھوٹ ہی نکلا۔ اس وار کو کارگر نہ پا کر آخر کار جماعت کو راست اقدام (رسشہ) کے ہنگاموں کی لپیٹ میں لے لیا۔ مذہبی عناصر کو بدنام کرنے اور ان کو تشدد کی چکی میں پیسنے کے لیے ان ہنگاموں نے جو سنہری موقع پیدا کر دیا تھا، اسے ضائع کر دینا یقیناً ہمارے بزرگوں کی سیاسی بصیرت کی توہین ہوتا۔ انہوں نے پوری جسارت سے مولانا مودودی کو موت کی سزا سنائی جو بعد میں چودہ برس اور سات برس کی متوازی شروع ہونے والی دو سزاؤں میں بدل کر رہ گئی۔ انہوں نے ملک نصراللہ خاں عزیز اور سید نقی علی اور جماعت اسلامی کی مطبوعات شائع کرنے والے دو چھاپہ خانوں کے مالکوں کو بھی قید کی سزائیں دے ڈالیں۔ انہوں نے پنجاب بھر میں جماعت کے ممتاز سیاسی کارکنوں کو سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا۔ انہوں نے جماعت کی ترجمانی کرنے والے اخبارات کا گلا گھونٹ ڈالا۔ انہوں نے جگہ جگہ سے دفاتر کے کاغذات قبضے میں لے لیے۔ انہوں نے مرکز کے بیت المال سے سوا دس ہزار روپیہ بھی اٹھا لیا۔

رہی سہی کسر پوری کرنے کے لیے جماعت اسلامی کو اضطراباتِ پنجاب کی تحقیقات کرنے والی عدالت کے سامنے پارٹی بنا کر کھڑا کر دیا۔ اس تحقیقات نے نہ صرف جماعت پر مالی مصارف کا بھاری بوجھ ڈال دیا، بلکہ کئی مہینوں کے لیے ہماری توجہ اور محنت کا اہم ترین مصرف یہی تحقیقاتی کارروائی بن گئی۔ آج ایک ایسی حسبِ دلخواہ رپورٹ حکومت کے ہاتھ میں ہے جو مخالفِ دین پروپیگنڈے کی مہم میں ایک اچھا ترکش ثابت ہو رہی ہے۔

لیکن جماعت کے سامنے "اسلامی دستور" کا جو بنیادی مسئلہ سات برس سے ہے، اس سے گردشِ زمانہ کے یہ سارے اُلٹ پھیر اسے غافل نہ کر سکے اور سال بھر تک کچلنے پسنے کے باوجود اس کی دعوتی و جماعتی سرگرمیوں میں کوئی خلا واقع نہیں ہو سکا۔ بلکہ اُلٹا اسیرانِ مارشل لاء کی رہائی کی عوامی طلب کے لیے جب وہ میدان میں نکلی تو اس نے دیکھا کہ پورا ملک اس کے ساتھ ہے اور دلوں کے دروازے پہلے سے زیادہ کھلے ہوئے ہیں۔ اس مہم کا یہ واضح نتیجہ تو بہت جلد نکلا کہ حکومت نے مارشل لاء کے قیدیوں کو دو دو چار چار کر کے رہا کر دیا، لیکن دوسری طرف مولانا مودودی کو روک رکھنے کے لیے جو چالیں چلی جا رہی تھیں وہ از اول تا آخر الم نشرح ہو گئیں اور لوگوں میں اس حقیقت کا عام شعور دلائل و شواہد کی بنا پر مستحکم ہو گیا کہ یہ سب کچھ سیاسی انتقام کا ایک مظاہرہ ہے۔ لوگوں کا یہ شعور پچھلے چند ماہ میں جلسوں، قراردادوں اور جلوسوں اور مظاہروں کے ذریعے جس زور شور سے نمایاں ہوا ہے اس کی وجہ سے جماعت اسلامی کے خلاف ایک مرتبہ پھر مسلم لیگی اکابر کے جذبات مشتعل ہو گئے ہیں۔ وہ ناراض ہیں کہ کیوں ہمارے سارے منصوبوں کو عوام کے سامنے بے نقاب کیا جا رہا ہے اور کیوں چپ چاپ وہ دھاندلی نہیں چلنے دی جا رہی ہے جسے ہم چلانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اوپر سے اور نیچے تمام سرکاری حلقوں میں برابر یہ سرگوشیاں ہو رہی ہیں کہ جماعت اسلامی کے خلاف سخت کارروائیاں کی جانی چاہئیں۔ سی۔آئی۔ڈی کے کارکن، پولیس کے عہدہ دار، ڈپٹی کمشنر اور سیکرٹری صاحبان (خصوصیت سے پنجاب میں جہاں مارشل لاء کے اسیروں کی مہم کا سب سے زیادہ زور رہا ہے) زبانی اور تحریری ہر طریق سے یہ مشورہ اوپر پہنچا رہے ہیں کہ جماعت اسلامی کی سرگرمیوں کی فوری روک تھام کی جانی چاہیے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں ان سرگرمیوں کو روکا جانے چاہیے؟

ناگزیر ہے کہ اس سوال کا ایک جواب فراہم کیا جائے تاکہ رائے عام کے سامنے کسی زیادتی کی توجیہ کی جا سکے۔ کوئی الزام، کوئی شبہ، کوئی اندیشہ، کوئی خطرہ، کوئی غلط فہمی، کوئی بدگمانی پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ پاکستان کی مخالفت، جہادِ کشمیر کے خلاف فتویٰ، نہرو گورنمنٹ سے ساز باز اور امریکہ کا روپیہ وغیرہ شوشے جس حد تک قابلِ استعمال تھے، استعمال ہو چکے، اور اب

زمانہ جان چکا ہے کہ ان کی اصل حقیقت کیا ہے۔ پس :-

"اب دانہ گرا اور، کوئی دام بچھا اور"

چنانچہ کہا جاتا ہے کہ "جماعت اسلامی کی سرگرمیوں سے لا اینڈ آرڈر کو خطرہ ہے، بعید نہیں کہ ۱۹۵۳ء کے سے حالات پھر پیدا ہو جائیں"! اب یہ ہے نئی مورچہ بندی! اس مورچہ بندی سے عام حملہ شروع ہو گیا ہے۔ پنجاب میں تو یہ حال ہے کہ جہاں جماعت اسلامی کی طرف سے جلسے یا مظاہرے کا اعلان ہوا جھٹ دفعہ ۱۴۴ لگا دی گئی۔ لاہور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، ملتان، لائل پور، میانوالی کے اضلاع پر تو دفعہ ۱۴۴ کا جھنڈا کئی ہفتوں کے لیے گڑ گیا ہے۔ بقیہ اضلاع میں یہ تلوار شہری آزادی کے سر پہ بالکل معلق ہے۔ جماعت کے پاکستان بھر کے امیر مولانا اصلاحی پر سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۵ کے تحت پابندیاں لگائی جا چکی ہیں۔ پریس ایمرجنسی ایکٹ کی دفعات اور ۱۲۴ الف کے تحت متعدد مقامات کارکنان جماعت پر چلائے جا رہے ہیں۔ ایک مقدمہ جماعت کی مجلس شوریٰ کے گذشتہ اجلاس کی قراردادوں کو سائیکلو اسٹائل کر کے اخبارات کو بھیجنے کے سلسلے میں مرکز کے ناظم نشر و اشاعت ارشاد احمد صاحب کے خلاف ابھی ابھی قائم کیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ "لا اینڈ آرڈر" کے نام پر ہو رہا ہے۔

ہم ان سطور کے ذریعے دلائل کی حد تک اس مفروضے کو بے سروپا ثابت کر دینا چاہتے ہیں تاکہ زیادتی جو کچھ بھی کی جائے اس کے آگے تاننے کے لیے توجیہ کا کوئی پردہ باقی نہ رہے۔ زیادتی بالکل زیادتی کی حیثیت سے دنیا بھر کے سامنے آئے۔ اس سلسلے میں ہم ایک ایک کر کے وہ تمام حقائق بیان کیے دیتے ہیں جنہیں بہت سے لوگ پہلے سے جانتے ہیں، لیکن جو نہیں جانتے اب وہ بھی جان لیں گے۔

(۱) یہ جماعت اقامت دین کے پاکیزہ نصب العین کے لیے سرگرم عمل ہے، اور اس کا بنیادی نظریہ، اس کا دستوری فیصلہ اور اس کی پالیسی کا مستقل جوہر یہ ہے کہ اس پاکیزہ نصب العین کے لیے طریق کار بھی پاکیزہ ہی اختیار کیا جا سکتا ہے جو ٹھیک ٹھیک دین برحق کے اصولوں پر مبنی ہو۔

(۲) اس جماعت کا ایک اصل الاصول یہ ہے کہ پیش آئندہ معاملات میں رائے قائم کرنے، فیصلہ دینے اور کوئی عملی قدم اٹھانے میں دیکھنے کی ایک چیز یہ ہے کہ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت

کی رہنمائی کیا ہے اور دوسری یہ ہے کہ اسلامی ریاست اور مسلمانوں کا مفاد کس چیز کا تقاضا کرتا ہے۔ ہمارے کام کی تاریخ گواہ ہے کہ آج تک جو کچھ کیا گیا ہے وہ انہی دو باتوں کو مدِ نظر رکھ کر کیا گیا ہے پہلی بات یعنی خدا اور رسول کی رہنمائی میں چلنا تو شاید پوری طرح واضح ہے لیکن دوسری بات ایسی ہے کہ جس کے بارے میں کچھ لوگوں کی معلومات دھندلی ہیں، لہٰذا اس کی وضاحت ضروری ہے۔

ہماری رائے میں اسلام کا تقاضا اور اسلامی ریاست اور ملت کا مفاد دو متضاد اور ٹکرانے والی چیزیں نہیں ہیں، بلکہ دونوں پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ جو کچھ اسلام کا تقاضا ہے وہی اسلامی ریاست اور ملت کا مفاد بھی ہے، اور اسلامی ریاست اور ملت کا حقیقی مفاد جو کچھ ہو سکتا ہے، ٹھیک وہی اپنی جگہ اسلام کا تقاضا بھی ہوتا ہے۔ ہمارا یہی وہ شعور تھا جس کے تحت مختلف مواقع پر بہت سے وقتی مسائل جب اُبھرے تو اس کے زیر اثر اجتہادی رائے جو قائم کی گئی وہ سراسر اسلامی ریاست اور ملت کے مفاد پر مبنی تھی اور ہمارے نزدیک اپنے وقت پر وہی اسلام کا تقاضا تھی۔ مثلاً:

——— ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کا قصرِ اقتدار منہدم ہو گیا اور متحدہ محاذ نے اس کی جگہ لے لی۔ ہم نے اگرچہ مسلم لیگ کے ہاتھوں بار بار سخت چرکے کھائے ہیں اور اس سے ہمارا اختلاف نہایت اصولی اختلاف ہے، لیکن مسلم لیگی اقتدار کے اس انہدام کو جو مقابلۃً ایک بدتر قوت کو آگے لے آیا تھا پاکستان کے باشندوں کے حق میں ایک تشویشناک حادثہ قرار دیا۔ دوسری طرف متحدہ محاذ کے غیر متجانس اجزائے ترکیبی اور اس کے انتشار انگیز نعروں کا جائزہ لے کر ضروری سمجھا کہ اس کے خلاف پوری قوت سے کام کیا جائے۔ چنانچہ وہ دن ملک کو بھولے نہ ہونگے جب کراچی میں، اور مغربی پاکستان کے دوسرے صوبوں میں متحدہ محاذ بنانے کے لیے لوگ اینٹ مسالہ جمع کر رہے تھے اور جب کہ ایوانِ اقتدار میں بیٹھے ہوئے مسلم لیگی حضرات کا تختِ جلال لرز رہا تھا تو اس وقت تنہا جماعت اسلامی میدان میں آئی اور یہ تہیہ کر کے آئی کہ مغربی پاکستان میں اس طرح کا متحدہ محاذ نہیں بننے دیا جائے گا، چنانچہ ہفتے بھر میں وہ آندھی چھٹ گئی اور مطلع صاف تھا۔ یہ فیصلہ ہم نے اسلام ہی کی رہنمائی کی روشنی میں اور ملت کے مفاد ہی کے تقاضے سے کیا تھا، اور اسے

عمل میں لانے کے لیے ہم نے مخالفین کے ان طعنوں کی پروا بھی نہیں کی کہ جماعت اسلامی کا مسلم لیگ سے سمجھوتہ ہو گیا ہے۔

——— اسی سلسلے میں دستور یہ کو توڑنے کا نعرہ بھی بلند ہوا تھا اور اتنے زور سے بلند ہوا تھا کہ دستور یہ کے بہت سے ارکان کے حوصلوں کے جہاز لنگر اور بادبان دونوں سے محروم ہو کر ڈانواں ڈول ہو رہے تھے۔ باوجودیکہ اس دستور یہ نے اسلامی دستور بنانے میں بڑی لیت و لعل سے کام لیا تھا، باوجودیکہ اس نے اب تک کے کام میں مضحکہ انگیز رخنے چھوڑے تھے اور باوجودیکہ اس کے ذمہ دار ارکان اسلامی دستور کے تقاضوں کو اپنی انٹی عملی سرگرمیوں سے پامال کر کے قوم کے لیے وجہ تشویش بنتے رہے تھے، لیکن چونکہ اسی دستور یہ نے ——— ردّ و کد کے بعد سہی ——— ابتدائی مسودۂ دستور میں اسلام کے بہت سے نمایاں اور بنیادی تقاضوں کو جذب کر لیا تھا، لہٰذا جس درجے کے کریڈٹ کی وہ مستحق تھی وہ کریڈٹ اسے دے کر ہم نے اس کو بچا لینا اسلام اور ملت کے مفاد کے لیے ضروری سمجھا۔ اُدھر سے کہا گیا کہ "دستور یہ توڑ دو!" ہم نے جواب میں چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ "یہ دستور یہ نہیں توڑی جائے گی۔" اور وہ تخریبی نعرہ ختم ہو گیا۔ یہ پارٹ ہم نے کسی دوسری طاقت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نہیں، بلکہ اپنے ہی اصول و مقصد کی خاطر ادا کیا۔

——— یہی صورت امریکی ایڈ کے مسئلے میں پیش آئی۔ ایک گروہ کا رجحان یہ تھا کہ فی نفسہٖ امریکی ایڈ کی مخالفت کی جانی چاہیے۔ ہم نے اس گروہ کے رجحان کو شکست دے دی۔ اور شرائط معاہدہ سامنے آنے سے قبل خواہ مخواہ کے مخالفانہ اظہارِ رائے سے انکار کر دیا۔ ہم سے جلسوں میں سوالات کیے گئے، ہم سے اخباری نمائندوں نے آ آکر ردِّ عمل معلوم کرنا چاہا، ہمارے متعلق غلط فہمیاں پھیلائی جانے لگیں مگر ہماری رائے یہی تھی کہ کسی ملک سے امداد لینے کو فی نفسہٖ حرام قرار دے لینا ریاست اور قوم کو لاینحل مشکلات میں مبتلا کرنا ہے، لہٰذا ہم نے بے معنی قسم کی پیشگی مخالفت سے انکار کر دیا۔ پھر جب شرائط معاہدہ سامنے آئیں تو ایک دوسرے گروہ کا یہ رجحان ہمارے سامنے آیا کہ ایڈ کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہیے لیکن ہم نے شرائط میں اسلام اور ریاست اور قوم کے لیے جن پہلوؤں کو خطرناک پایا، ایمانداری کے ساتھ

ان کی نشاندہی کردی۔

——— ٹھیک انہی دو اصولوں پر ہم نے ختم نبوت کی تحریک میں اپنی جماعتی پوزیشن متعین کی یعنی اسلام کے منشا کے مطابق ایک طرف اصل مقصد کی پوری پوری تائید کی، لیکن دوسری طرف تحریک نے جب بھی کوئی موڑ آئین اور اخلاق کے خلاف مڑنا چاہا تو ہم نے کسی ایسی چیز میں حصہ لینے سے دامن بچایا جو اسلام کے اصولوں یا ریاست اور ملت کے مفاد کے خلاف پڑتی ہو۔

ان چند نمایاں مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جماعت اسلامی کسی چیز کی مخالفت یا حمایت کے لیے جب رائے قائم کرتی یا کوئی قدم اٹھاتی ہے تو وہ گروہی کشمکش، جماعتی سیاسیات، مفاد و اغراض اور حریفانہ جذباتیت سے بالاتر ہو کر ایک اصولی کسوٹی اپنے سامنے رکھتی ہے۔

(۳) اس جماعت کے اب تک کے طریق کار کا ایک اصول یہ ہے کہ آئین کی جگہ لاقانونی اور نظم کی جگہ بدنظمی پیدا کر کے کام نہیں کرنا ہے، بلکہ ساری جدوجہد دستور و آئین کی حدود میں نظم کو برقرار رکھتے ہوئے جاری رکھنی ہے۔ غالباً کوئی ادنیٰ مثال بھی قانون شکنی کی ہمارے اب تک کے کام سے اخذ کر کے سامنے نہیں لائی جا سکتی۔ ہمیں جس چیز سے حکماً یا قانوناً روک دیا جاتا ہے اس سے ہم رک جاتے ہیں، جو پابندی لگائی جاتی ہے اسے چار و ناچار گوارا کرتے ہیں، جو حدود عمل حکومت باقی رہنے دیتی ہے انہی حدودِ عمل میں کام کرتے ہیں۔ کام کرنے والوں کے لیے ہر قسم کی پابندیوں کے اندر بھی ایک نہ ایک دائرۂ کار باقی رہتا ہے اور ہم اپنا کام اسی دائرہ میں جاری رکھتے ہیں۔ یہ گویا ہمارا مستقل مزاج ہے۔ کیا یہ مزاج اس امر کی ایک شہادت نہیں کہ جماعت اسلامی سے لا اینڈ آرڈر کو کبھی کوئی خطرہ پیش نہیں آسکتا۔

(۴) جماعت کے کام میں ہر پہلو سے سنجیدگی اور وقار کا گہرا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس کے جلسوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ نظم اور خاموشی اور باقاعدگی کا یہ ایک اونچا معیار ملک بھر کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ تقریروں کا یہ عالم ہے کہ صرف وہ قابل اعتماد ارکان تقریر کرنے کی اجازت حاصل کر سکتے ہیں جن کے خیالات مرتب، جن کا علم کافی اور جن کو زبان اور جذبات پر پوری پوری قدرت ہو،

پھر وہ متعین موضوع پر تقریر کی تیاری کرتے ہیں اور اس حد تک کرتے ہیں کہ فقرے اور الفاظ تک پہلے سے سوچ کر آتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تقریروں میں ایکٹنگ کی جائے، شعر پڑھے جائیں، کہانیاں سنائی جائیں، گھٹیا زبان استعمال کی جائے، بلکہ ذہنی تربیت کے لیے پروفیسروں کی طرح کے معلومات افزا اور مربوط لکچر دیئے جاتے ہیں۔ لوگوں کی یہی تربیت کرنے کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے یہ ریاضی کے لکچر" لوگ سکون کے ساتھ بیٹھ کر سنتے ہیں۔ ان تقریروں میں کبھی کھوکھلی جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کیا گیا، کبھی لوگوں کو اشتعال کا نشہ نہیں پلایا گیا، کبھی ان کو بھڑکانے کی کوشش نہیں کی گئی، اور کبھی انہیں نعروں کے سیلاب میں بہائے جانے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

لا اینڈ آرڈر کو توڑنے والوں کے انداز یہ نہیں ہوا کرتے!

(۵) ہمیں دستور اور مارشل لاء کے قیدیوں کے سلسلے میں بے شمار جلوس نکالنے اور مظاہرے کرنے کی بھی ضرورت پیش آئی ہے۔ چنانچہ مطالبۂ دستور کے جو جلوس لاہور اور کراچی اور دوسرے شہروں میں نکالے گئے تھے، وہ جہاں اپنی عظمت اور کثرتِ شرکاء کے لحاظ سے یادگار تھے۔ وہاں اپنے وقار، نظم اور ڈسپلن کے لحاظ سے بھی تاریخی حیثیت رکھتے تھے۔ ابھی حال ہی میں راولپنڈی میں بھی جلوس نکالا جا چکا ہے۔ پھر بے شمار مظاہرات ان دنوں میں جابجا ہوتے ہیں۔ کیا کسی ایک جگہ بھی لا اینڈ آرڈر کی نکسیر تک پھوٹی؟

جماعت اسلامی جلوس نکالنے اور مظاہرہ کرنے سے پہلے اپنے بہترین دماغوں کی مدد سے کام کی منصوبہ بندی کرتی ہے۔ اس کا پورا نقشہ بنتا ہے، اس کی حدود طے ہوتی ہیں، اس کے پلے کارڈ اور اس کے نعروں کی عبارت مقرر کی جاتی ہے۔ اس میں شریک ہونے والوں کے لیے باقاعدہ نظم تجویز ہوتا ہے، اس پورے کام کو کنٹرول کرنے کی ذمہ داری نامزد افراد پر ڈالی جاتی ہے۔ شرکاء کو مختلف پیش آئند صورتوں کے لیے ہدایات دی جاتی ہیں، اتنی تیاری ہو چکتی ہے تو پھر عمل کا قدم آگے بڑھتا ہے۔ یہ اہتمام کر کے جو لوگ گھر سے چلتے ہوں، کیا وجہ ہے کہ ان سے لا اینڈ آرڈر کو کوئی خطرہ لاحق ہو؟

(۶) لا اینڈ آرڈر کے لیے وہ لوگ خطرہ بن سکتے ہیں جنہیں اشتعال میں لایا جا سکتا ہو (باقی ص۲ پر)

# تزکیۂ نفس

## تزکیۂ علم ——— اسوۂ حسنہ

(مولانا امین احسن اصلاحی)

——— (۲۰) ———

یہ بات واضح ہو جانے کے بعد کہ معرفتِ الٰہی کا قابلِ اعتماد ذریعہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو سکتے ہیں دوسرا اہم سوال ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ آپ کے منصبِ رسالت کی حیثیت اور آپ کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ عہد صحابہ و تابعین کے گذرنے کے بعد سے اس چیز کے بارہ میں ہمارے درمیان بہت کچھ اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور اس اختلاف کا اثر حصولِ معرفت کے اس مقصد پر بھی لازماً پڑتا ہے جو آپؐ کی ذاتِ گرامی سے وابستہ ہے۔ اس وجہ سے ہم چاہتے ہیں کہ پہلے اختصار کے ساتھ نقطہائے نظر کا یہ اختلاف واضح کردیں، اس کے بعد تفصیل کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کریں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہماری کس نوعیت کی وابستگی معرفتِ الٰہی کے مقصد کے لیے کارآمد ہو سکتی ہے اور یہ وابستگی پیدا کرنے کے لیے ہمیں کن باتوں کا اہتمام کرنا ہے اور کس قسم کی جدوجہد عمل میں لانی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ رسالت کی حیثیت اور آپ کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کے بارہ میں خود مسلمانوں کے اندر جو غلط تصورات پیدا ہو چکے ہیں وہ ہیں تو بہت سے لیکن ہم ان سب کی تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ہم صرف چار بنیادی غلط فہمیوں کی طرف اشارہ کریں گے جو ہمارے چار بڑے بڑے گروہوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔

۱۔ ہمارے اندر ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہی حیثیت سمجھتا ہے جو ایک کاتب اور مکتوب الیہ کے درمیان کسی معتمد ہرکارہ اور

ایک دیانت دار چٹھی رساں کی ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کام بس یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کتاب اپنے عبدوں پر نازل فرمانی چاہی وہ آپؐ نے ان کو پہنچا دی۔ اس کے بعد آپ کا کام ختم ہوگیا۔ وہ اپنے اسی تصور کے لحاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت متعین کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ منصبِ رسالت کا اس قدر حقیر تصور رکھتے ہوں ان کے لیے معرفتِ الٰہی کے نقطۂ نظر سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔ اور جب آپ کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہ جاتی تو آپ کی ذات کے ساتھ کسی غیر معمولی وابستگی کے لیے بھی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ جب اصلی کام آپ کا صرف خط کا پہنچا دینا تھا اور آپ خط پہنچا چکے تو اس کے بعد اگر کوئی اہمیت باقی رہتی ہے تو خود اصل خط کی ہے یا زیادہ سے زیادہ کاتب کی۔ نہ کہ خط کے لانے والے قاصد کی؟ اس کے بعد تو اگر قاصد درمیان سے سرے سے غائب بھی ہو جائے جب بھی ان حضرات کے نقطۂ نظر سے کوئی خلا نہیں واقع ہونا چاہیے۔

رسالت کا یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے۔ نبی، خدا اور اس کے بندوں کے درمیان صرف ایک قاصد اور نامہ بر ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک معلّم بھی ہوتا ہے، ایک مزکّی بھی ہوتا ہے، ایک مرشد بھی ہوتا ہے، ایک مبیّن بھی ہوتا ہے، ایک مبشّر بھی ہوتا ہے، ایک مُنذر بھی ہوتا ہے، ایک سراجِ منیر بھی ہوتا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک واجب الاطاعت ہادی بھی ہوتا ہے۔ اور پھر اپنی ان تمام خصوصیتوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ارشاد و ہدایت کے فرائض کے سلسلہ میں براہ راست خدا کی نگرانی میں ہوتا ہے جس کے سبب سے وہ غلطی اور گمراہی کے تمام خطروں سے بالکل محفوظ و مامون ہوتا ہے۔ اس کا فریضہ صرف یہی نہیں ہے کہ وہ خدا کی کتاب بندوں کو پہنچا دے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ وہ اس کتاب کے تمام اسرار و رموز لوگوں کو سمجھا دے، اس کتاب پر عمل کر کے دکھا دے، اس کتاب پر عمل کرنے والوں کا ایک گروہ اپنی تعلیم و تربیت سے تیار کر دے اور اس کتاب کے مضمرات ان کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں میں نمایاں کر دے۔ ان سارے کاموں میں اس کی اپنی ذات ایک عامل کی حیثیت سے بھی شریک ہوتی ہے اور ایک رہنما کی حیثیت سے بھی شریک ہوتی ہے۔ اور اپنی اس دوسری حیثیت میں جو کچھ وہ کہتا ہے یا کرتا ہے یا جس چیز کو وہ منظور کر لیتا ہے اس کو اسی کتاب کے اور اس کے منصبِ رسالت کے تحت ہی سمجھا جاتا ہے اور اسی

حیثیت سے اس کو قبول کیا جاتا ہے۔

رسالت کے اس تصور کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم جتنی گوناگوں نوعیتوں کے تعلقات رکھتے ہیں اتنی گوناگوں نوعیتوں کے تعلقات نہ دنیا میں ہمارے کسی کے ساتھ ہیں، نہ ہو سکتے ہیں۔ اور اس سے آپ سے آپ یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اگر کوئی شخص ان گوناگوں تعلقات کی نوعیت سے اچھی طرح واقف نہ ہو یا ان میں سے بعض کا یا کُل کا منکر ہو تو وہ ہرگز آپ کی ذات بابرکات سے وہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتا جس کے لیے آپ کی بعثت ہوئی ہے۔

۲۔ دوسرا گروہ جو منصب رسالت کے متعلق سخت غلط فہمیوں میں مبتلا ہے وہ ہمارے ارباب تصوف کا ہے۔ یہ لوگ اول تو شریعت اور طریقت اور علم ظاہر اور علم باطن کی الگ الگ حد بندیاں قائم کیے ہوئے ہیں پھر مزید ستم یہ کرتے ہیں کہ ان دونوں علموں کو ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق کر دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ جہاں تک علم ظاہر یا علم شریعت کا تعلق ہے اس کی تعلیم تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں کو دی لیکن علم باطن یا علم طریقت کی تعلیم آپ نے بطور ایک راز کے صرف چند مخصوص لوگوں ہی کو بتائی اور پھر انہی لوگوں کے واسطہ سے یہ علم سینہ بہ سینہ تصوف کے مختلف سلسلوں تک منتقل ہوا۔ اور وہی اس راز کے امین بنے۔

اس خیال کے اندر جو خرابیاں ہیں اور اس سے منصب نبوت کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور پھر اس سے معرفت الٰہی کے نصب العین کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کی طرف ہم اب کتاب کی پہلی فصل[1] میں بعض اشارات کر چکے ہیں۔ یہ خیال اگرچہ غلط ہے لیکن غلط ہونے کے باوجود ہمارے نزدیک کم از کم اس پہلو سے غنیمت ہے کہ اس میں علم ظاہر اور علم باطن دونوں کا سرچشمہ نبی ہی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ علم شریعت کا سرچشمہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کیا گیا ہو لیکن علم طریقت کا سرچشمہ کسی اور کو قرار دے دیا گیا ہو۔ ورنہ اہل تصوف میں تو ایک گروہ ایسا بھی ہے جو نبوت اور ولایت کے دو الگ الگ بالکل متوازی منصب تسلیم کرتا ہے۔ پھر ان میں سے ایک کو وہ علم ظاہر کا (یعنی علم شریعت کا) سرچشمہ قرار دیتا ہے اور دوسرے کو علم باطن کا۔ اس گروہ کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جس طرح

[1] کتاب کی یہ فصل ترجمان بابت فروری و مارچ ۱۹۵۳ء میں چھپ چکی ہے۔

خاتم الانبیاء کا منصب مخصوص ہے اسی طرح بعض اشخاص کے لیے ان کے نزدیک خاتم الاولیاء کا منصب مخصوص ہے ۔ ان کے نزدیک یہ دونوں منصب بالکل دو متوازی نظاموں کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ دو مستقل متوازی نظاموں کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ ان کے درمیان رقابت اور کشمکش کی حالت رہے ۔ چنانچہ ان کے درمیان بھی برابر زنیا نہ چوٹیں چلتی رہی ہیں ۔ طریقت کے علمبردار شریعت کے حامیوں کو ظاہر پرست اور بے مغز قرار دیتے ہیں اور شریعت کے حامی طریقت کے حامیوں کو مبتدع اور گمراہ ٹھیراتے ہیں ۔ اور اس تعصب اور غلو نے بڑھتے بڑھتے یہ شکل اختیار کرلی ہے کہ بہت سے صوفی حضرات شریعت کو اپنی طریقت کے مقابل میں پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتے اور معرفتِ الٰہی کے نقطۂ نظر سے ان کی نگاہوں میں جو مرتبہ شیخ محی الدین بن عربی کا ہے وہ العیاذ باللہ کسی نبی کا بھی نہیں ہے ۔

ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص منصبِ رسالت کے متعلق اس سوءِ ظن میں مبتلا ہو جائے تو اس کو معرفتِ الٰہی کا ایک ذرہ بھی حاصل نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ بزعم خویش علم باطن میں اتنا کمال حاصل کرلے کہ ہوا میں اڑنے اور پانی پر دوڑنے لگ جائے ۔ معرفتِ الٰہی کا اصلی ذریعہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی ہیں اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم النبیین ہیں اور آپ کی شریعت آخری اور کامل شریعت ہے اس وجہ سے لازماً آپ خاتم الاولیاء اور خاتم العارفین بھی ہیں ۔ معرفت کا جو مقام آپ کو حاصل ہوا وہ نہ کسی اور کو حاصل ہوا اور نہ ہو گا اور علم کا جو خزانہ آپ کی شریعت کے اندر پوشیدہ ہے وہ خزانہ نہ کسی اور چیز کے اندر ہے اور نہ ہو سکتا ہے ۔

۴- ہمارے اندر ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ماضی کی ایک قابلِ احترام شخصیت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا ۔ اگرچہ ساری قوم چونکہ آپ کو رسول کہتی ہے اس وجہ سے یہ لوگ بھی آپ کو رسول ہی کہتے ہیں اور قومی روایات کے زیرِ اثر آپ کے لیے حمیت اور عصبیت کا جذبہ بھی ایک حد تک رکھتے ہیں ۔ لیکن یہ بات ان لوگوں کے دل میں کسی طرح بھی نہیں دھنستی کہ آپ جس معاملہ میں جو کچھ فرما گئے ہیں وہی حرفِ آخر ہے اور انسان کی دنیوی اور اخروی سعادت کا انحصار بس اس کو بے چون و چرا مان لینے ہی میں ہے ۔ ان لوگوں کے نزدیک آپ نے جو کچھ بتایا اور سکھایا وہ ایک مخصوص

زمانہ اور ایک مخصوص ماحول کے لیے تو بے شک ٹھیک تھا لیکن علم و روشنی کے اس زمانہ میں بھی انہی چیزوں پر اصرار کیے جانا ان کے خیال میں جہالت اور حماقت ہے۔ اب آپ کی بتائی ہوئی باتوں میں سے اگر کچھ چیزیں ماننے جانے کے قابل ہیں تو یا تو وہ ہیں جو خود انکی اپنی خواہشات کے مطابق ہیں یا وہ ہیں جن کو خوش قسمتی سے موجودہ زمانہ بھی قدر و احترام کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ ان کے علاوہ کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو یہ لوگ دل سے گوارا کرنے کے لیے تیار ہوں اگرچہ اپنی کمزوری اور بزدلی کے سبب سے اس کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہ رکھتے ہوں۔

۴۔ ہمارے عوام الناس کا ایک بڑا طبقہ ایسے لوگوں پر بھی مشتمل ہے جن کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بس ایک اندھی بہری عقیدت کا مرجع ہے وہ مختلف اوقات میں اپنی اس عقیدت کا اظہار کرکے اپنے خیال میں آپ کی نبوت و رسالت کے تمام حقوق و واجبات سے اپنے آپ کو سبکدوش کر لیتے ہیں۔ انہیں اس سے کچھ بحث نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کس مقصد کے لیے دنیا میں تشریف لائے تھے، آپ نے دنیا کو کیا تعلیم دی، اپنے بعد امت کے اوپر کیا ذمہ داریاں چھوڑ گئے اور ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے ہمیں کیا کچھ کرنا ہے۔ ان سوالوں پر غور کرنے اور ان کے تقاضے پورے کرنے کے بجائے وہ اپنے تصورات کے مطابق آپ کی ذات کے ساتھ اظہار عقیدت کر لینے کو کافی سمجھتے ہیں اگرچہ اس اظہار عقیدت کا طریقہ صریحاً آپ کی تعلیمات اور ہدایات کے خلاف ہو۔ جاہل پیروں اور مولویوں کی ایک جماعت نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عوام کے اس جذبۂ عقیدت سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ شریعت کی حقیقی ذمہ داریوں سے محفوظ رہتے ہوئے عوام میں مقبول بننے کا یہ راستہ بہت سہل ہے کہ عوام کی اس جاہلانہ عقیدت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب رسالت سے اٹھا کر خدائی کے منصب پر متمکن کرنے کی کوشش کی اور اپنے زعم کے مطابق اس کے دلائل فراہم کیے۔ دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اظہار عقیدت و محبت کے ایسے طریقے ایجاد کیے جن سے ان کو اپنی خواہشات نفس کی تسکین کے لیے شریعت کی تمام پابندیوں سے کھلی چھٹی مل جائے۔ اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام اور آپ کی

محبت و عقیدت کا کلمہ پڑھتے ہوئے اُن تمام عقائد کی بنیادیں بھی ڈھا دی گئیں جن سے معرفت الٰہی کی راہیں کھلتی تھیں اور وہ تمام اعمال و اخلاق بھی برباد کر دیے گئے جو اس معرفت کو جلا دینے والے تھے۔ جس ذات کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اس مقصد کے لیے بھیجا تھا کہ وہ لوگوں کے لیے رہنما بنے اور ان کو خدا کا راستہ دکھائے اسی کے نام کو ان ظالموں نے اس مقصد کے لیے استعمال کیا کہ لوگوں کو خدا کے راستہ سے ہٹا کر ان کو گمراہی کے راستوں پر ڈال دیں۔

**نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی صحیح نوعیت** نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت اور آپ کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت سے متعلق ہمارے اندر جو گمراہیاں آج پھیلی ہوئی ہیں ان میں سے ہم نے یہ چند بڑی بڑی گمراہیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر معرفت الٰہی کے حصول کا واحد راستہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی ہے تو ان گمراہیوں کی موجودگی میں آپ کے ساتھ نہ تو ہمارا صحیح ربط ہی قائم ہو سکتا اور نہ وہ چیز ہی ہم آپ سے حاصل کر سکتے جس کے حاصل ہونے کا آپ واحد ذریعہ ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ جن بنیادوں پر قرآن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمیں اپنا تعلق استوار کرنے کی ہدایت کی ہے ہم وہ بنیادیں واضح کر دیں۔ تاکہ جو شخص خدا تک پہنچنا چاہے وہ خدا تک پہنچنے کے واحد ذریعہ کے ساتھ اپنی ٹھیک ٹھیک وابستگی قائم کر سکے۔

ہمارے نزدیک قرآن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کو مندرجہ ذیل چار بنیادوں پر قائم کیا ہے:۔

**ایمان** نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی پہلی بنیاد ایمان ہے۔ ایمان کا مطلب صرف یہ مان لینا نہیں ہے کہ آپ اللہ کے آخری رسول ہیں بلکہ ایمان کی اصلی روح آپ کی ذات پر سچا اور پکا اعتماد ہے۔ اس بات کا اعتماد کہ آپ صادق اور امین ہیں۔ اس بات کا اعتماد کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے اور جو کچھ کیا ہے اس میں سے کوئی بات بھی جھوٹ اور غلط نہیں ہو سکتی، اس بات کا اعتماد کہ آپ کے ہر قول اور ہر فعل کے اندر گہری حکمت ہے اگرچہ وہ حکمت ہماری سمجھ میں نہ آ رہی ہو۔ اس بات کا اعتماد کہ آپ نے جو راہ دکھائی ہے اگرچہ بظاہر اس میں کتنے ہی خطرات نظر آ رہے ہوں لیکن نجات اور فلاح

کی حقیقی راہ وہی ہے۔اس بات کا اعتماد کہ آپ نے زندگی کے جو اصول سکھائے ہیں وہ وقتی اور عارضی نہیں ہیں بلکہ وہ ذاتی اور ابدی ہیں اور انسان ان سے کبھی بھی مستغنی نہیں ہو سکے گا اور سب سے بڑھ کر اس بات کا اعتماد کہ خدا کی معرفت کا جو طریقہ آپ نے بتایا اور سکھایا ہے اس سے بڑھ کر نہ کوئی اور طریقہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

جب تک آدمی کے اندر یہ اعتماد نہ پیدا ہو مجرد اس تصدیق سے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں آدمی ایمان کی حقیقی لذت سے آشنا نہیں ہوتا اور نہ یہ ایمان اس معرفت کے نقطۂ نظر سے کچھ کارآمد ہوتا جو اس ایمان کی حقیقی غائت ہے۔اسی وجہ سے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربّا وبالاسلام دینا وبمحمد رسولا[۱]

ایمان کا مزہ اس نے چکھا جو اللہ کے اپنا رب ہونے پر، اسلام کے اپنا دین ہونے پر اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اپنا رسول ہونے پر مطمئن ہو گیا۔

یہی اعتماد ہے جس کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر حضرت عمرؓ کو دی۔ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یا رسول اللہ ہم کبھی کبھی یہود سے ایسی باتیں سنتے ہیں جو بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض باتیں لکھ لیا کریں؟ آپ نے فرمایا "کیا جس طرح یہود و نصاریٰ اپنے دین کے بارہ میں حیرانیوں میں پڑ گئے تم بھی اسی طرح حیرانیوں میں پڑنا چاہتے ہو؟ میں نے تمہارے سامنے اللہ کے دین کو بالکل روشن اور شفاف صورت میں رکھا ہے۔اگر آج موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو ان کے لیے بھی میری پیروی کے سوا چارہ کار نہ تھا۔"[۲]

یہی بات ایک دوسری روایت میں کچھ مختلف طریقہ پر وارد ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے حضرت عمرؓ پر کچھ خفگی کا بھی اظہار فرمایا۔حضرت عمرؓ کو جب حضور کی خفگی کا احساس ہوا تو وہ فوراً پکار اٹھے کہ رضیت باللہ ربا و بالاسلام دینا و بمحمدؐ نبیًا۔میں اللہ کے اپنا رب ہونے پر

---

[۱] مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنہ　　[۲] مشکوٰۃ، باب مذکور

اسلام کے اپنا دین ہونے پر اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اپنا نبی ہونے پر پوری طرح مطمئن ہوں۔

ان حدیثوں سے صاف واضح ہے کہ جہاں تک اللہ کی معرفت کا راستہ دکھانے اور خدا کی صراط مستقیم کو واضح کرنے کا تعلق ہے یہ کام بہتر سے بہتر طریق پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دے دیا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ جیسے جلیل القدر پیغمبر بھی اگر آپ کے بعد ہوتے تو اسی طریقہ کی پیروی کرتے۔ ظاہر ہے کہ حق کی رہنمائی کے نقطۂ نظر سے جب آنحضرت صلعم اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کے بعد حضرت موسیٰ اور ان کی شریعت کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تو دوسرے اشخاص اور ان کے علوم و افکار اور نظریات و تجربات کی کیا وقعت باقی رہتی ہے۔ دوسرے علوم و افکار اگر کچھ قابل لحاظ ہو سکتے ہیں تو صرف اس حد تک ہو سکتے ہیں جہاں تک وہ کتاب و سنت کے موافق و موئید ہوں۔ اگر کوئی شخص اس حد سے بڑھ کر کسی فکر و فلسفہ کو، یا کسی وجدان و کشف کو یا کسی طریقہ اور تجربہ کو نبی کے علم و عمل پر ترجیح دے یا اس کے برابر ہی ٹھہرائے یا اس کسوٹی پر جانچے بغیر ہی اس کو تسلیم کرے اور اس کے ساتھ ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا بھی دعویٰ کرے تو اس کا دعوائے ایمان محض ایک فریبِ نفس ہے کیونکہ اس کا ایمان اس اعتماد سے بالکل خالی ہے جو اس ایمان کی اصل روح ہے۔

**اطاعت** نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی دوسری شرط آپ کی کامل اطاعت ہے۔ دنیا میں کوئی نبی اور رسول بھی محض اس لیے نہیں بھیجا گیا کہ بس اس کو مان لینے کی حد تک لوگ نبی اور رسول مان لیں بلکہ اس کے بھیجے جانے سے اصل شئے جو مقصود رہی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور زندگی کے معاملات میں جو احکام و ہدایات وہ دے اس کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے اس حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (نساء۔ ۶۴) ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

دوسری جگہ ہے کہ آدمی کے نیک اعمال کی قبولیت کا انحصار ہی اس بات پر ہے کہ وہ اللہ کے رسول کی اطاعت کرے۔ اگر وہ اطاعت نہ کرے تو اس کے تمام نیک اعمال رائگان ہو جاتے ہیں

یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَکُمْ ۔ (محمد ۳۴)

اے ایمان لانے والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور اپنے اعمال کو رائگاں نہ کرو۔

رسول کی اطاعت کے مطالبہ کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی اطاعت جو اصل مقصود ہے اس کا راستہ ہی یہی ہے کہ خدا کے رسول کی اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ براہ راست معاملہ نہیں کرتا بلکہ اپنے رسول کے واسطہ سے کرتا ہے۔ رسول ہی لوگوں کو اس کی ہدایات اور اس کے احکام سے آگاہ کرتا ہے۔ اس وجہ سے جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے گویا اللہ کی اطاعت کی

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ

جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی

رسول کا ہاتھ لوگوں کے لیے اللہ کے ہاتھ کا قائم مقام ہوتا ہے۔ جو لوگ رسول کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ گویا بالواسطہ اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (الفتح - ۱۰)

جو لوگ تم سے بیعت کر رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ ہی سے بیعت کر رہے ہیں، اللہ ہی کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔

خود احادیث میں بھی اس حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ اللہ کی اطاعت کا راستہ یہی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی جائے۔ مثلاً

من اطاع محمداً فقد اطاع اللہ و من عصی محمداً فقد عصی اللہ و محمد فرق بین الناس (بخاری)

جس نے محمدؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے محمدؐ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اللہ کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان محمدؐ ہی نشان امتیاز ہیں۔

قرآن مجید میں یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی ہے کہ یہ اطاعت محض ظاہری اور رسمی قسم کی مطلوب نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ آدمی پورے طور پر اپنے آپ کو خدا کی کتاب اور پیغمبر کی سنت کے تابع کر دے۔ آپس میں جتنے قضیے اور مسئلے بھی پیدا ہوں ان سب کے طے کرنے کے لیے کتاب و سنت کی ہی

طرف رجوع کیا جائے اور پھر کتاب و سنت کے فیصلہ کو دل کے پورے اطمینان اور طبیعت کی پوری رضامندی کے ساتھ قبول کیا جائے، اس کے خلاف دل کے اندر کسی قسم کی بدگمانی یا شکایت نہ رہے۔ فرمایا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔ (نساء - ۶۵)

پس نہیں تیرے رب کی قسم وہ مومن نہیں ہیں جب تک کہ ان تمام معاملات میں جو ان کے درمیان پیدا ہوں وہ تم کو حکم نہ بنائیں اور پھر تمہارے فیصلہ سے اپنے دلوں کے اندر کوئی تنگی بھی نہ محسوس کریں اور وہ پورے طور پر اپنے آپ کو تمہارے تابع نہ بنائیں۔

ان آیات و احادیث کے ظاہری الفاظ سے کسی کو یہ دھوکا نہ ہو کہ ان کا تعلق صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی ہی سے تھا اور جب آپ کی ذات خاص ہمارے درمیان نہیں رہی تو اس اطاعت کا سوال بھی باقی نہیں رہا۔ آپکی وفات کے بعد اللہ کی کتاب اور آپکی سنت امت کے اندر آپ کی قائم مقام ہے اس وجہ سے اب انہی دونوں چیزوں کی اطاعت آپکی اطاعت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے پہلے اس کی وصیت بھی فرما دی تھی۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنۃ رسولہٖ[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں جب تک تم ان دونوں پر مضبوطی سے قائم رہو گے اس وقت تک تم گمراہ نہ ہو گے۔

علاوہ ازیں ایک اسلامی حکومت کے وہ امراء اور حکام بھی اسی حکم میں داخل ہیں جو زمین میں خدا کی کتاب اور آپ کی سنت کے نافذ کرنے والے ہوں۔ اس کی تصریح بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن اطاع الامام فقد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے

---

[1] مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ۔

اطاعنی ومن عصانی فقد عصی اللہ ومن عصی الامام فقد عصانی[۱]

امام کی اطاعت کی تو اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امام کی نافرمانی کی تو اس نے میری نافرمانی کی۔

اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے کی اصلی حقیقت یہ ہے کہ آپ نے کتاب اور سنت کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور اس کے احکام سے ہمیں جو آگاہ فرمایا ہے ہم ان کی پوری پوری اطاعت کریں۔ اگر محض زبان سے آنحضرت صلعم کی رسالت کا اقرار کیا جائے اور اطاعت اپنی ہوائے نفس کی یا اپنی آزاد مرضی کے ساتھ، رسول کی ہدایات کے خلاف، دوسروں کی کی جائے تو اس طرح رسول کو رسول ماننا وہ ماننا نہیں ہے جس سے معرفت الٰہی کے دروازے کھلیں بلکہ اس طرح کا ماننا آدمی کے خسران اور اس کی بدبختی میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔

**اِتّباع** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد اِتّباع ہے۔ اتباع کا دائرہ اطاعت سے زیادہ وسیع ہے۔ اطاعت کے دائرہ میں تو عموماً وہی باتیں آتی ہیں جن کی حیثیت احکام و واجبات اور اوامر و نواہی کی ہو لیکن اتّباع کے دائرہ میں مستحبات و نوافل بھی آجاتے ہیں۔ پھر اطاعت بعض حالات میں محض ظاہری اور رسمی بھی ہوسکتی ہے، آدمی ایک شخص کی اطاعت کرتا ہے لیکن اس کی اطاعت میں اخلاص اور محبت کا جذبہ ذرا بھی شامل نہیں ہوتا، لیکن اتّباع میں متبوع کے لیے عقیدت و احترام کا جذبہ بھی پایا جانا شرط ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف اطاعت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ آپ کی اتباع بھی کرتے تھے۔ وہ صرف اس بات کا انتظار نہیں کرتے تھے کہ آپ کسی بات کا حکم دیں تو وہ اس کی تعمیل کریں یا کسی بات سے روکیں تو اس سے رک جائیں بلکہ وہ آپ کی ایک ایک ادا کو دیکھتے، اس کو نگاہ میں رکھتے، اور پھر اس کی تقلید کرتے تھے۔ آپ کس طرح اٹھتے ہیں، کس طرح بیٹھتے ہیں، کس طرح سوتے ہیں، کس طرح جاگتے ہیں، کس طرح چلتے ہیں، کس طرح گفتگو کرتے ہیں، کس طرح کھانا کھاتے ہیں، کس طرح

---

[۱] بخاری، کتاب الاحکام

ہاتھ دھوتے ہیں، کس طرح وضو کرتے ہیں، کس طرح نماز پڑھتے ہیں؟ غرض وہ آپ کی تمام حرکات و سکنات پوری طرح نظر میں رکھتے اور پھر ان میں سے ہر شخص کی یہ دلی خواہش ہوتی کہ وہ اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سانچے میں ڈھالے۔ اور یہ اہتمام وہ کسی خارجی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ محض محبت و عقیدت کے جذبہ سے سرشار ہو کر کرتے تھے۔

اتباعِ رسول میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس ذوق و شوق کی وجہ یہ تھی کہ خدا کی محبت اور محبوبیت کا درجہ صرف اطاعتِ رسول سے نہیں بلکہ درحقیقت اتباعِ رسول سے حاصل ہوتا ہے۔ رسول خدا کی معرفت کا مظہرِ اتم ہوتا ہے۔ اس کی ایک ایک ادا معرفتِ الٰہی کا نشان ہوتی ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ خدا سے محبت رکھتے ہیں وہ رسول کی ایک ایک ادا سے محبت رکھتے ہیں۔ وہ رسول کے اندر وہ علم دیکھتے ہیں جو خدا کی معرفت سے حاصل ہوتا ہے، وہ عمل دیکھتے ہیں جو خدا کی معرفت سے پیدا ہوتا ہے، وہ عادات دیکھتے ہیں جو خدا کو پسند ہیں، وہ صفات دیکھتے ہیں جو خدا کو محبوب ہیں، وہ جمال دیکھتے ہیں جس پر جمالِ خداوندی کا پرتو ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ رسول کے ایک ایک نقش کو تلاش کر کر کے اس کی پیروی کرتے ہیں اور چونکہ یہ سب کچھ وہ خدا کی محبت میں کرتے ہیں، اس وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا صلہ یہ پاتے ہیں کہ وہ اللہ کے محبوب بن جاتے ہیں یہی حقیقت قرآن مجید کی مندرجۂ ذیل آیت میں بیان کی گئی ہے:-

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔ (آل عمران)

کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

درحقیقت رسول کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہی یہی ہے کہ معرفتِ الٰہی کا جو عکس انسان کی زندگی پر پڑنا چاہیے اس کو رسول کی روزمرہ زندگی میں مشاہدہ کرا دیا جائے۔ اگر باطن میں معرفت کا نور جلوہ گر ہو تو ظاہر کی ایک ایک چیز میں جو نورانیت ہونی چاہیے، پیغمبر کی زندگی اس کا کامل نمونہ ہوتی ہے اس وجہ سے اس کی زندگی کی ایک ایک ادا کو پیروی کے لیے اسوۂ حسنہ کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے اور جو اس اسوۂ حسنہ کی پیروی میں جتنا ہی ترقی کرتا ہے وہ خدا کی محبت اور اس کی محبوبیت میں اتنی ہی ترقی کرتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ — تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔

**محبت** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی چوتھی شرط آپ کے ساتھ ہماری محبت ہے۔ دین میں نہ ایمان یا وہ اطاعت معتبر نہیں ہے جس کی بنیاد محبت پر نہ ہو۔ ایسی اطاعت جس کی تہ میں محبت کا جذبہ کارفرما نہ ہو بعض حالات میں محض نفاق ہوتی ہے۔ پھر محبت بھی محض رسمی اور ظاہری قسم کی مطلوب نہیں ہے بلکہ ایسی محبت مطلوب ہے جو تمام محبتوں پر غالب آجائے، جس کے مقابل میں عزیز سے عزیز رشتے اور محبوب سے محبوب تعلقات کی بھی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہ جائے، جس کے لیے دنیا کی ہر چیز کو چھوڑا جا سکے لیکن خود اس کو کسی قیمت پر بھی نہ چھوڑا جا سکے۔ قرآن مجید میں اس محبت کا معیار یہ قرار دیا گیا ہے:

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ۔ (التوبہ - ۲۴)

کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارے خاندان اور مال جو تم نے کمایا ہے، اور تجارت جس کے گر جانے کا تمہیں اندیشہ ہے، اور مکانات جو تمہیں پسند ہیں، اگر یہ ساری چیزیں تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کر دے۔

اسی حقیقت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے احادیث میں بھی واضح فرمایا ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ کسی شخص کا ایمان بالرسول متحقق نہیں ہو سکتا جب تک وہ مجھ کو اپنے باپ بیٹے اور دوسرے تمام عزیزوں اور قرابتداروں سے زیادہ عزیز نہ رکھے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے

والدہ وولدہ والناس اجمعین۔[1] نزدیک اس کے باپ، اس کے بیٹے اور دوسرے

(متفق علیہ) تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کی محبت کے بعد ہی کوئی شخص ایمان کی حقیقی لذت سے آشنا ہو سکتا ہے۔

ثلث من کن فیہ وجد بھن حلاوۃ الایمان - من کان اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما۔ (الحدیث) (متفق علیہ)

تین چیزیں جس شخص میں ہوں گی وہ ان کے سبب سے ایمان کا مزا چکھے گا، ایک وہ شخص جس کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول دوسری تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں

لیکن یہ بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جس محبت کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اس سے مقصود محض وہ جذباتی محبت نہیں ہے جو آدمی کو فطری طور پر اپنے بیوی بچوں یا اپنے دوسرے عزیزوں کے ساتھ ہوتی ہے بلکہ اس سے مقصود وہ عقلی اور اصولی محبت بھی ہے جو ایک شخص کو کسی اصول اور کسی مسلک کے ساتھ ہوا کرتی ہے اور جس کی بنا پر وہ ہر جگہ اس اصول اور اس مسلک کو مقدم رکھتا ہے۔ اس اصول اور اس مسلک کے اوپر وہ ہر چیز، ہر اصول، ہر مسلک اور ہر خواہش اور ہر حکم کو قربان کر دیتا ہے لیکن خود اس کو دنیا کی کسی چیز پر بھی قربان نہیں کرتا۔ اس اصول اور مسلک کی برتری کے لیے وہ ساری چیزوں کو پست کر دیتا ہے لیکن اس اصول اور مسلک کو کسی حالت میں بھی پست دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ اگر اس سے خود اس کا اپنا نفس اس مسلک کی مخالفت میں مزاحم ہوتا ہے تو وہ اس سے بھی لڑتا ہے اور اگر دوسرے اس سے مزاحم ہوتے ہیں تو ان کا بھی وہ مقابلہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے بیوی بچوں اور اعزا و اقارب کے مطالبات بھی اگر اس کے اس مسلک کے مطالبات سے کسی مرحلہ میں ٹکراتے ہیں تو وہ اپنے اصول اور مسلک کا ساتھ دیتا ہے اور بے تکلف اپنے بیوی بچوں کی خواہشوں اور اپنے خاندان اور قوم کے مطالبہ کو ٹھکرا دیتا ہے

اس محبت کا اصولی اور عقلی ہونا خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں واضح فرما دیا ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ باب الایمان [2] ایضاً

آپ کا ارشاد ہے :-

من احب سنتی فقد احبنی ومن احبنی کان معی فی الجنۃ (ترمذی)

جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔

**اطاعت بلا محبت اور محبت بلا اتباع** اس تفصیل سے جہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارا ایمانی تعلق اس وقت تک استوار نہیں ہو سکتا جب تک اس ایمان کی بنیاد اطاعت، اتباع اور محبت پر نہ ہو۔ وہیں مختلف اشارات سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اطاعت بلا محبت کے نفاق اور محبت بلا اطاعت و اتباع کے بدعت ہے۔

یہ بات کہ اطاعت بلا محبت کے نفاق ہے خود قرآن مجید سے نہایت واضح طور پر ثابت ہے۔ حوالیٔ مدینہ کے بہت سے اعراب اسلام کی سیاسی طاقت بڑھ جانے کے بعد اسلامی احکام و قوانین کی ظاہری اطاعت کرنے لگے تھے لیکن یہ اطاعت محض سیاسی مصالح کے تحت مجبورانہ تھی، اللہ اور رسول کی محبت اور اس ایمان کا نتیجہ نہیں تھی جس کی اصلی روح اخلاص و اعتماد ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے جب بعض مواقع پر اپنے ایمان کا دعویٰ اس طرح کیا جس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ انہوں نے ایمان لا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اور اسلام پر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہے تو قرآن نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کی کہ ان مدعیان ایمان سے کہہ دو کہ محض اسلامی احکام و قوانین کی ظاہری اطاعت سے آدمی مومن نہیں ہو جایا کرتا بلکہ ایمان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ اخلاص و محبت بھی شرط ہے، اور یہ چیز تمہارے اندر چونکہ مفقود ہے اس وجہ سے ابھی تمہارا دعوائے ایمان بھی غلط ہے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (الحجرات - ۱۴)

اور یہ اعرابی لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے ہو البتہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت کر لی ہے۔ ابھی ایمان تمہارے دلوں کے اندر نہیں داخل ہوا ہے۔

رہی دوسری بات یعنی محبت بلا اطاعت و اتباع کا بدعت ہونا تو یہ اوپر کی آیات و احادیث سے واضح طور پر نکلتی ہے

جس طرح قرآن مجید نے اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ والی آیت میں اللہ کی محبت کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ نبی کی اتباع کی جائے اور بغیر اتباعِ نبیؐ کے اللہ کی محبت کے جتنے طریقے ایجاد کیے گئے ہیں ان سب کو بدعت و ضلالت قرار دیا ہے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے من احب سنّتی فقد احبّنی والی حدیث میں یہ واضح فرمادیا کہ آپ سے محبت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کی سنت کے ساتھ محبت کی جائے اور بعض دوسری حدیثوں میں آپ نے اپنی محبت میں اس قسم کے غلو کی ممانعت فرمائی ہے جس قسم کا غلو نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ کی محبت میں کیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ ہدایت اور یہ ممانعت اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن آپ کی سنت کی پیروی نہیں کرتے، اوّل تو ان کا دعوے ہی بے حقیقت ہے اور اگر اس کے اندر سچائی کی کوئی رمق ہے بھی تو ان کی یہ محبت بالکل بے معنی محبت ہے اور اگر انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کرنے کے کچھ ایسے طریقے بھی ایجاد کر لیے ہیں جو صریحاً آپ کی سنت کے خلاف ہیں تو یہ اسی طرح کی بدعت ہے جس طرح کی بدعت نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی محبت میں کی ہے کہ ان کو پیغمبر کے بجائے خدا بنا کے بٹھا دیا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محض عقلی اور اصولی ہی نہیں تھی بلکہ جذباتی بھی تھی لیکن یہ جذبات کبھی حدودِ کتاب و سنت سے متجاوز نہیں ہوتے تھے۔ ایک طرف یہ حال تھا کہ صحابہؓ اپنے اوپر بڑی سے بڑی تکلیف اٹھا لیتے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تلووں میں ایک کانٹے کا چبھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں ان کے اپنے جسم تیروں سے چھلنی ہو جاتے تھے لیکن وہ یہ نہیں برداشت کر سکتے تھے کہ ان کے جیتے جی آپ کا بال بھی بیکا ہو، مرد تو مرد عورتوں تک کے جذبات کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے بیٹے اور شوہر اور باپ اور بھائی سب کو قربان کر کے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سلامتی کی آرزو میں رکھتی تھیں۔ دوسری طرف اتباعِ سنت کا یہ اہتمام تھا کہ اس محبت سے

مغلوب ہو کر بھی کبھی کوئی ایسی بات ان سے صادر نہیں ہوتی تھی جو آپ کی صریح ہدایات تو درکنار آپ کی پسند ہی کے خلاف ہو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ بیان ملاحظہ ہو:۔

عن انس قال لم یکن شخص احب الیھم من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکانوا اذا رأوہ لم یقوموا لما یعلمون من کراھیتہ لذلک (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی شخص بھی محبوب نہ تھا۔ لیکن جب وہ آپ کو دیکھتے تو آپ کی تعظیم کے لیے نہ کھڑے ہوتے کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ آپ اس بات کو ناپسند کرتے تھے۔

لیکن آج اگر ہم مسلمانوں کا جائزہ لیں تو ان کے اندر عظیم اکثریت ایسے ہی لوگوں کی نکلے گی جو یا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس ایمان کے ساتھ اطاعت موجود نہیں ہے، یا محبت کا دم بھرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ اتباعِ سنت نہیں ہے۔ اطاعت اور اتباع دونوں کی جگہ انہوں نے اپنے جی سے چند چیزیں ایجاد کرلی ہیں ——— کچھ میلاد کی مجلسیں منعقد کر دیتے ہیں، کچھ دیگیں پکوا کے تقسیم کر دیتے ہیں، ایک آدھ جلوس نکلوا دیتے ہیں، کچھ نعرے لگوا دیتے ہیں ——— بس اس طرح کی کچھ باتیں ہیں جن سے ان کا ایمان اور ان کی محبتِ رسول عبارت ہے۔ آپ کو کتنے ایسے اشخاص مل جائیں گے جنہوں نے نماز مدت العمر نہیں پڑھی لیکن مہینہ میں میلاد کی مجلسیں اور قوالی کی محفلیں کئی بار منعقد کرتے ہیں، مال رکھتے ہوئے زکوٰۃ ادا کرنے کی ان کو کبھی توفیق نہیں ہوتی لیکن اپنی ان بدعات پر جو وہ رسول اللہ صلعم کے نام پر کرتے ہیں، ہر سال ہزاروں روپے خرچ کر دیتے ہیں، ان کو اس بات کی کبھی توفیق نہیں ہوتی کہ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کا مطالعہ کریں اور ان کی روشنی میں اپنی زندگیوں کا جائزہ لے کر ان کو درست کرنے کی کوشش کریں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں اپنے آپ کو ہر وقت سرشار ظاہر کرتے ہیں اور نعتیہ اشعار پڑھ کر یا سُن کر ان پر وارفتگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

یہ حالت ہمارے کسی ایک ہی طبقہ کی نہیں ہے بلکہ ہمارے اکثر طبقے اس قسم کی محبتِ رسول کے دعویدار ہیں اور اگر کچھ لوگ اتباعِ سنت کا دعویٰ بھی کرتے ہیں تو ان کا حال بھی یہ ہے کہ ان کے نزدیک تمام سنت بس چند اختلافی مسائل کے اندر سمٹ آئی ہے۔ بس انہی چند چیزوں پر ان کا سارا زور صرف ہوتا ہے۔ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت صرف انہی چند مسائل کی تعلیم کے لیے ہوئی تھی۔

# انسانیت کی تعمیرِ نو اور اسلام

(عبد الحمید)

(۵)

اب ہم نہایت ہی اختصار کے ساتھ "دینِ اشتراکیت" کے ان چار[1] بنیادی ارکان، تاریخ کی مادی تعبیر، طبقاتی نزاع، قدرِ زائد، اور نظریۂ ریاست کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔

مارکس نے ایک ایسی فکری فضا میں پرورش پائی جس میں مادہ کے متعلق یہ نظریہ کارفرما تھا کہ دنیا کے یہ سارے حوادث جنہیں ہم محسوس کرتے ہیں ناقابلِ احساس ذرات کے عمل سے پیدا ہوتے ہیں شعور اور ذہن بھی مادہ ہی کے افعال ہیں۔ مادہ وجودِ مطلق ہے، باقی جو کچھ ہے وہ اس کا مظہر۔ مارکس نے اپنے فلسفہ کی بنیاد مادہ کے اسی تصور پر رکھی اور اس طرح اس نے تاریخِ انسانی کی ایک ایسی تعبیر کرنا چاہی جس میں مادیت کو اس کارخانۂ حیات کے سارے حادثات کا تنہا خالق قرار دیا جا سکے۔ اسی سے وجودِ باری تعالیٰ کی نفی کی گئی، روح کا انکار کیا گیا لیکن خوش قسمتی سے خود سائنس نے اب اس بنیاد کو یکسر باطل قرار دیا ہے۔ فطرت کا پرانا تصور نیوٹن کے نظریہ پر مبنی تھا جس کی رُو سے مکان ایک خلائے مطلق ہے جس میں اشیا واقع ہیں۔ مگر اب مادہ کا سکون آفریں تصور قابلِ قبول نہیں رہا۔ فطرت اب کوئی ساکن وجود نہیں مانی جاتی جو ایک غیر متحرک خلائے مکانی میں اپنا وجود رکھتی ہو بلکہ یہ حوادث کی ایک خاص ترکیب ہے۔ یہ ایک قسم کا مسلسل تخلیقی میلان ہے جس کو ہمارا تصور الگ الگ منفرد اور غیر متحرک اشیاء میں تقسیم کر دیتا ہے جن کی بدولت زمان و مکان کے تصورات پیدا ہوتے ہیں[2]۔

مادہ کے اس جدید تصور نے مارکسی اندازِ فکر کو بیخ و بن سے اکھیڑ دیا ہے۔ مارکس کا دعویٰ یہ ہے

---

[1] ان تصورات کا تعارف اس مضمون کے تحت ترجمان القرآن جلد ۴۱ عدد ۳ میں کیا جا چکا ہے۔

[2] "اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید" از ڈاکٹر محمد اقبالؒ

کہ اس کائنات میں اصل حقیقت مادہ ہے اور انسانی افکار و تصورات اُس کے پرتو۔ مگر اب خود سائنس انسان کو اس مقام پر لے آئی ہے جہاں اصل چیز ذہن قرار پاتی ہے اور عالم طبیعی اس کا عکس۔ اس لحاظ سے خارجی اشیاء بجائے خود حوادث کا سبب نہیں ہو سکتیں اور نہ ہی وہ ہمارے احساس کو جنم دے سکتی ہیں۔ ذہن کے بغیر عالم کا ربط و ضبط ناممکنات میں سے ہے۔ ہم جسے فطرت کہتے ہیں اس کے بے ترتیب اور بے ربط طومار میں اس وقت ترتیب و تنظیم پیدا ہوتی ہے جب کہ ذہن اپنے تصورات کے سانچے میں اس کو ڈھالتا ہے۔ مارکس جس انسان کا مطالعہ کرتا ہے وہ بے شعور انسان ہے جس کی حیثیت طبیعی قوانین کے ایک کھیل سے زیادہ نہیں۔ وہ اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے کہ آگہی اور وقوف کے وجود میں آنے سے ہی انسان کی آزادی کی ابتدا ہوئی اور اس دَور کا خاتمہ ہوا جب وہ مجبورِ محض تھا۔ اب انسان زمان و مکان کے تعیّنات کا پابند نہیں بلکہ دورِ آفاق اپنی رفتار کے پیچ و خم کو اس کے اشارۂ ابرو کے مطابق معین کرتا ہے ؎

برخیز کہ آدم را ہنگامہ نمود آمد
ایں مشتِ غبارے را انجم بسجود آمد (اقبالؒ)

اس لحاظ سے مادہ نہ تو انسانی افکار و افعال کا خالق ہے اور نہ ہی ان کے نشو و نما کا اصل محرک۔ انسان شعور کی قوت سے مسلح ہو کر مادی دنیا سے متصادم ہوا اور مزاحمت کی صلاحیتیں پیدا کر کے اُس نے اپنی الیغو ( EGO ) کو مستحکم کرنا سیکھا۔ یہ مادی دنیا وہ دشت ہے جس کی پیمائی سے اُس نے اپنے خلوص، عظمت اور برتری کا ثبوت پیش کیا۔ مگر یاد رہے کہ "قیس" کی یہ صحرا نوردیاں صرف بیابانوں کی خاک چھاننے کے لیے نہیں، وہ اپنی اس مجنونانہ جدوجہد میں خاک کے ذروں کو تلاش نہیں کرتا بلکہ اُس کی نگاہِ شوق کسی ایسے پیکرِ خیالی کو ڈھونڈتی ہے جس نے ان ذروں کو پامال کیا۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ انسانی افعال کا اصل محرک مادہ نہیں بلکہ اثباتِ خودی کا وہ جذبہ ہے جو انسان میں روزِ اوّل سے ودیعت کیا گیا ہے۔ یہ جذبہ ہر آن نئی خواہشات اور نئے عزائم کی تخلیق کرتا ہے اور اس طرح اپنی توسیع و بقا کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ مادی دنیا اور

اُس کے وسائل کو استعمال میں لاتا ہے۔ دنیا میں انسان نے جس قدر ترقی کی ہے وہ سب اسی ایک جذبہ کی رہین منت ہے۔ اسی کے ذریعہ نوعِ انسانی نے طریقِ پیدائش کی نئی نئی گرہیں کھولیں، ایجادات کی دنیا میں محیر العقول کارنامے دکھائے، زمین کے کلیجے کو چاک کر کے اس میں حیرت انگیز فراوانی کے ساتھ اناج اُگایا، اس کی گہرائیوں میں اُتر کر معادن کو تلاش کیا۔ ہوا میں اُڑنے، بجلی کو قابو میں کرنے، ہوا کے تموّج اور ذرات کو اپنے نامہ و پیام کا ایلچی بنانے اور خود بخود بجنے والے باجوں اور ہوش رُبا سرعت سے چلنے والی سواریوں کے کرشمے اسی ایک اثباتِ خودی کا نتیجہ ہیں۔

اگر مادّی ماحول کو ہی ان تحقیقات کی علتِ غائی قرار دیا جائے اور ہر نئی قوت کے معلوم ہو جانے کو محض ایک اتفاقی حادثہ سمجھ لیا جائے تو یہ مسئلہ خاطر خواہ حل نہیں ہوتا۔ جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ترقی اور ارتقاء کے اسباب صرف یہی دو ہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر حیوان اس سعادت سے کیوں محروم رہے۔ مادّی ماحول کی تنگ دامانی نے انہیں اس کام پر کیوں نہیں اُبھارا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ان میں وہ قوتِ فکر ناپید ہے جو کسی کام کی تعمیر کے لیے ضروری ہے۔ معاملہ پھر یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مادّی ماحول کی جکڑ بندیوں میں گرفتار سارے انسانوں کو پیداواری قوتوں کی تلاش و جستجو میں یکساں کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔ چند خوش نصیب جن کو فطرت نے ذہانت کے خزانوں سے وافر حصہ عطا کیا ہے وہ اس میدان میں کامیاب و کامران ہوئے اور باقی ان تھک کوششوں کے باوجود نامراد رہے۔

یہ سب واقعات جو تاریخ انسانی کی بدیہی شہادتیں ہیں مادّی نظریۂ تاریخ کو کھلا چیلنج ہیں۔ مارکس کے نزدیک پیداواری قوتیں انسان کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی تصورات کو جنم دیتی ہیں مگر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسان کی ذہنی استعداد، قوتِ فکر اور رجحانِ طبع نے پیداواری قوتوں کا کھوج لگا کر انہیں استعمال میں لانے کے لیے ابنِ آدم کو نئے نئے طریقوں سے شناسا کیا۔

اس کارخانۂ حیات میں انسان کے معاشی تقاضوں کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ ہمیں اس امر میں جو چیز اختلاف ہے وہ یہ کہ تہذیب و تمدن کی ہر چیز ان تقاضوں کی کرشمہ سازی نہیں بلکہ اس کی تعمیر میں

دوسرے عوامل بھی اسی طرح شامل ہیں جس طرح کہ معاشی۔ انسان کو حیاتِ مستعار کی چند گھڑیاں گزارنے کے لیے کھانے کی ضرورت ہے، گرمی اور سردی سے بچنے کے لیے لباس درکار ہے، سر چھپانے کے لیے وہ مکان کا محتاج مگر اس کی یہ ضروریات اور اُن کی فراہمی کی مختلف تدابیر اُس کی ذہنی اور شعوری کیفیات کو تخلیق نہیں کرتیں۔ ایک مصوّر تصویر کے بنانے میں مختلف رنگوں سے کام لیتا ہے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ کبھی نہیں نکالا جا سکتا کہ مصوّر کے مختلف رنگ ہی اُس کے آرٹ کے اصلی خالق ہیں۔ پیدائشی قوتیں اور حالات پیداوار ایک دوسرے پر اسی طرح اثر انداز ہوتے ہیں جس طرح نئے اسلحہ کی ایجاد طریقِ جنگ کو متاثر کرتی ہے۔ مگر اس سے اگر کوئی سمجھ بیٹھے کہ جنگ کے شعلوں کو بھڑکانے کا سب سے بڑا محرک اسلحہ کی ترقی اور فوجی تنظیم کی وسعت ہے اور دنیا کی عسکری تاریخ کے ارتقاء کا یہی ایک سبب ہے تو اس کے فاترالعقل ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

مارکس نے اپنے فلسفۂ تاریخ میں جس بے راہ روی کا مظاہرہ کیا اُس کو بعض بڑے بڑے مخلص اشتراکیوں تک نے محسوس کیا اور اپنے پیرو مرشد کی اس "مجذوبانہ بڑ" کی کوئی معقول تعبیر پیش کرنے کی سعی کرتے رہے۔ چنانچہ پروفیسر جی۔ ڈی۔ ایچ اپنی کتاب مارکسزم کے مطالب ( MEANING OF MARXISM ) میں لکھتا ہے:۔

> "سماج کی معاشی تنظیم میں، سیاسی اداروں اور معاشرتی نظام میں ایک رابطۂ اتحاد دریافت کیا جا سکتا ہے اور یہ سمجھنا بھی کسی حد تک آسان ہے کہ کس طرح عہد ماضی میں سیاسی اور معاشرتی نظام معاشی حالات کے مطابق بدلتے رہے ہے۔ مگر اس نظریہ کو اس حد سے زیادہ بڑھانا خطرناک ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ سماج جو پیدائش کے طریقوں کے لحاظ سے ایک ہی سطح پر ہوں ان کی معاشی تنظیم، خاندانی نظام، گروہی تعلقات، سیاسی اور مذہبی اوامر یا اخلاقی تصورات بھی ایک سے ہوں۔ علم انسانیات کی جدید تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس دنیا میں بعض ایسے تمدن معرضِ وجود میں آئے جن کی کوئی معاشی وجہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ اگر ان میں کوئی باہمی مناسبت موجود ہے تو وہ صرف اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ

سماجی اداروں پر معاشی حالات اثر انداز ہوتے رہے۔ سماج کی معاشی بنیاد کو اگر سب سے زیادہ اہم بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ بے شمار عوامل میں سے صرف ایک عمل ہے۔"

تاریخ انسانی میں ایسے بیشمار واقعات ملتے ہیں جو اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ قوموں کی تعمیر میں معاشی محرکات سے کہیں زیادہ اہم غیر معاشی محرکات ثابت ہوئے۔ مثال کے طور پر ہم صرف ایک واقعہ پیش کرتے ہیں۔ مارکس نے تاریخ انسانی کو جن مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے اُس کے مطابق رومی اور قرنِ اوّل کے مسلمان معیشت کے ایک ہی دور میں تھے۔ یعنی دونوں اقوام میں غلامی کا رواج تھا، پیدائش دولت کے طریق بھی دونوں کے ہاں ایک جیسے تھے۔ مارکس کے نظریہ کے مطابق ان دونوں قوموں کو اخلاق کی ایک ہی سطح پر ہونا چاہیے تھا لیکن تاریخی شہادتیں اس کے خلاف ہیں۔ تاریخ کا ایک مبتدی بھی اُس عظیم فرق سے بخوبی واقف ہے جو ان دونوں قوموں کے اخلاقی تصورات کے درمیان پایا جاتا ہے۔ رومیوں کا اپنے غلاموں سے سلوک اس قدر سخت اور وحشتناک تھا کہ اس کے تصور سے آج بھی جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُس کے برعکس اسلام نے اس مظلوم طبقے کو ظلم واستبداد سے نجات دلائی، اسے حیوانیت کی سطح سے اُٹھا کر انسانیت کے معراج پر پہنچایا۔ یہ بات کس قدر حیرت انگیز ہے کہ ایک قسم کے ملکیتی تعلقات کے اندر رہتے ہوئے بھی دونوں قوموں کے اخلاقی نظریے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ قوموں اور افراد کی زندگی کی تعمیر میں فیصلہ کن قوت معاشی نہیں بلکہ وہ مقاصد ہیں جن کی سعی وطلب کے لیے وہ زندہ ہیں۔ انہی کی قوت سے وہ ہر قسم کے موانع پر چاہے وہ معاشی ہوں یا عمرانی، فتح حاصل کرتے ہیں۔ مقاصد کی لگن جس قدر گہری اور شدید ہوگی اسی نسبت سے انسان اپنے اندر تسخیر فطرت کی صلاحیت پیدا کر سکیں گے اور وہ مادی ماحول کو اپنی ضروریات کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب ہونگے۔ اس لیے کسی قوم یا فرد کی سیرت کی تعمیر میں اصل قوت وہ آئیڈیل ہے جس کے لیے کوئی قوم یا انسان زندہ ہے۔ اسی موضوع پر کارل فیڈرن ( KARLFEDERN ) بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کسی قوم کی آئیڈیالوجی ( IDEOLOGY ) صرف اس کے

معاشی ماحول کی پیداوار ہے تو اس سے یہ نتیجہ از خود بر آمد ہوتا ہے کہ وہ سارے انسان جو ایک ہی قسم کے معاشی ماحول میں رہتے ہیں اُن کے خیالات و افکار ایک ہی قسم کے ہونے چاہئیں۔ مگر عملی زندگی میں ہم حالات اس سے بالکل مختلف پاتے ہیں — نہ صرف ایک جیسے معاشی حالات میں زندگی بسر کرتے ہوئے بلکہ ایک ہی خاندان کے اندر رہتے ہوئے بھی لوگوں نے زندگی کی مختلف راہیں اختیار کیں ؎

آیئے اب اسی مسئلہ پر ایک دوسرے زاویہ سے نگاہ ڈالیں

مارکس کے اس نظریہ میں جو قصرِ اشتراکیت کا سنگِ بنیاد ہے سب سے زیادہ تناقض دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف تو وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ انسان کے اندرونی محرکات سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ سراسر مادی اور خارجی ماحول کا نتیجہ ہیں، مگر دوسری طرف وہ مٹی کی ان بے بس مشینوں" کے افکار و افدار پر نیک و بد، محمود و مذموم کا فتویٰ بھی صادر کرتا ہے۔ جب انسان خارج کا بے بس آلۂ کار ٹھیرا جس کی حیثیت اس کارگہِ حیات میں ایک بے بس کھلونے سے کچھ زیادہ نہیں تو پھر انسانی آزادی اور اخلاقیات کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ مگر مارکس جیسا فلسفی، ان دو "اَن میل" تصورات کو جوڑنے کی سعی کرتا ہے۔ وہ اپنے دعویٰ کو تو پوری شدت کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ انسان خارجی احوال اور گرد و پیش کے اثرات کا مجبور بندہ ہے اور اس کی ذہنیت و سیرت بالکلیہ خارجی اثرات سے تشکیل پاتی ہے مگر جب اس دعویٰ کے منطقی نتائج کو وہ دیکھتا ہے کہ اس سے ہر قسم کے افعال کو جائز اور برحق ماننا پڑے گا تو فوراً ان کا انکار کرتا ہے۔ جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہر چیز خارجی حالات سے میکانکی طور پر پیدا ہوتی ہے اور ہمارے ارادہ و اختیار کے بغیر ہم سے سرزد ہوتی ہے یا ہم پر مسلط رہتی ہے۔ تو اس لحاظ سے وہ بُری یا اچھی کیسے کہلائی جا سکتی ہے لہٰذا مذہب اور اُس کے معتقدات ماننے پر ہم مجبور ہیں کیونکہ وہ بھی ہمارے خارج اور ہمارے گرد و پیش سے وجود میں آتے ہیں۔ اُن کا وجود ہی اُن کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جو کچھ کہ دنیا میں ہو رہا ہے یا کیا جا رہا ہے سب کو مبنی بر انصاف ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ سرمایہ دار اپنی

معاشی لوٹ کھسوٹ میں، سامراج کے نمائندے اپنے سیاسی ظلم و ستم میں اور فاسقی اُمرا اپنے جابرانہ افعال میں اسی طرح مجبور ہیں جس طرح اشتراکی حضرات اپنی انقلاب انگیزی میں۔ انسان کے کسی فعل اور اُس کی کسی تدبیر کو باطل قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ دنیا آزاد، ذمہ دار اور اخلاقی انسانوں کی دنیا نہیں بلکہ وہ ایسی کٹھ پتلیوں کی تماشا گاہ ہے جن کی ڈور کو مادی ماحول کا بیتاک ہاتھ ہلا رہا ہے۔ کیا اشتراکیت کے حامی، جن کے حلق اپنے مخالفین کو کوستے کوستے سوکھ رہے ہیں۔ اپنے "شیخ طریقت" کے فرمان کے اس طبعی نتیجہ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں۔

(۲) مارکس کا دوسرا نظریہ بھی انسانی فطرت کے متعلق نہایت ہی گھناؤنے تصور پر مبنی ہے۔ اُس کے نزدیک انسان میں کبھی بھی نیکی، صداقت، انصاف پسندی جیسی صفات عالیہ پرورش نہیں پا سکیں۔ وہ کبھی بھی از خود اپنے حقوق سے زائد سے دست بردار ہونے پر رضامند نہیں ہوا۔ اُس کے دل میں کبھی یہ جذبہ موجزن نہیں ہوا کہ وہ صلح، آشتی اور اپنی ضمیر کی پکار پر دوسروں کے جائز حقوق اُن کو لوٹا دے۔ مادی زندگی اور اُس کی لذتوں سے بڑھ کر اُسے آج تک کسی چیز کا خیال نہیں آیا اُسے جب بھی خیال آیا تو یہی کہ وہ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالے، اُس نے جب کبھی سوچا تو وہ یہی تھا کہ وہ اس دنیا کے ساز و سامان کو زیادہ سے زیادہ سمیٹے۔ وہ ہمیشہ سے منافق، دھوکہ باز چالاک اور عیار رہا ہے۔ وہ مذہب، اخلاق، خدا ترسی، حق و صداقت کے نام پر کمزوروں کو لوٹتا رہا اور اپنے افعال کو پسندیدہ دکھانے کے لیے یہ نام استعمال کرتا رہا۔ انسان نے آج تک جتنے معاشرے قائم کیے ہیں۔ اُن سب کی تاریخ طبقاتی نزاع کی تاریخ ہے۔ مختلف انسان ہر دور میں اور ہر ملک میں صرف ڈیوں کی تقسیم پر باہم برسرِ پیکار رہے ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بسا اوقات مظلوم طبقے اپنے جائز حقوق کے حصول کے لیے ظالموں کے مقابلے میں صف آرا ہوئے مگر یہ کہنا تو یقیناً غلط ہے کہ ساری تاریخ محض اس نزاع و کشمکش کی داستان ہے یا یہ کہ انسانی معاشرے کی تمام تبدیلیوں کا واحد سبب صرف یہی طبقاتی تقسیم ہے۔ تاریخ کے اوراق سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ قومی لڑائیوں کے اثرات طبقہ واری لڑائیوں سے کسی طرح کم نہ تھے بلکہ یہ کہنا بھی

حقیقت سے دُور نہ ہو گا کہ قومی لڑائیاں طبقہ واری لڑائیوں سے زیادہ کثیر الوقوع، زیادہ تند و تیز، زیادہ خونریز اور انسانی مستقبل کے لیے زیادہ فیصلہ کن تھیں۔ آپ تاریخ انسانی پر جس قدر گہری نگاہ ڈالیے اسی قدر اس حقیقت کو تسلیم کریں گے کہ انسان زیادہ تر قوموں، نسلوں کے پرچم تلے لڑتے رہے۔ خود ہمارے زمانہ میں، جب کہ دنیا کے سارے انسان مارکسیوں کے بقول دو طبقوں میں بٹ گئے ہیں جتنی لڑائیاں ہوئی ہیں ان میں قومی احساس اور ہم وطنی کے جذبات طبقاتی شعور سے زیادہ موثر اور طاقتور ثابت ہوئے۔ کیا جرمنی کے مزدور روس کے مزدوروں سے بر سرِ پیکار نہیں ہوئے۔ کیا انگلستان کے غریب طبقوں نے اس جنگ میں غیر ملکی پرولتاریہ برادری کے مقابلہ میں اپنے ہی وطن کے ظالم بورژوا کے دوش بدوش کھڑے ہو کر اپنی قوم کی حفاظت نہیں کی۔ کیا ہندوستان کی تقسیم طبقاتی کشمکش کا نتیجہ تھی یا اس کے اسباب کچھ اور تھے۔ یہ سب واقعات اپنی جگہ پر اس قدر ٹھوس حقائق ہیں کہ انہیں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ انسان کے اندر اثباتِ خودی کا جذبہ موجود ہے۔ وہ جب کبھی اپنی خواہشات یا اپنے عقائد و مسلمات کی راہ میں کوئی سنگِ گراں پاتا ہے، فوراً آمادۂ پیکار ہو جاتا ہے۔ محض معاشی ضروریات اور مادّی تقاضے یا طبقاتی کشمکش سے تاریخ کی لڑائیوں کی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔

پھر جس اصول کی بنا پر مارکس انسانیت کو دو طبقوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اُس اصول کو ہی اس دَور نے بالکل غلط ثابت کر دیا ہے۔ مارکس کا خیال ہے کہ وہ لوگ جو پیداواری قوتوں پر قابض ہوتے ہیں وہ ایک طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو ان ذرائع سے کام لے کر "قدرِ زائد" پیدا کر کے اپنے آقاؤں کے لیے سامانِ راحت فراہم کرتے ہیں۔ ان کا رشتۂ اتحاد مظلوم پرولتاریہ سے ہوتا ہے۔ پھر یہ پرولتاریہ اور بورژوا اپنے اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے دوسرے سے جنگ آزما ہوتے ہیں۔ مارکس نے جن حالات میں اپنا یہ نظریہ تصنیف کیا اُس وقت صرف یہی دو گروہ تھے مگر رفتارِ زمانہ نے ایک تیسرے گروہ کو جنم دیا ہے جنہیں نہ تو بورژوا میں شامل کیا جا سکتا ہے اور نہ پرولتاریہ میں۔ یہ طبقہ اُن مزدوروں پر مشتمل ہے جنہیں کارخانوں کے نظم و نسق میں اور اُن کے منافع میں شریک کیا جاتا ہے۔ ان کی ایک حیثیت مظلوم محنت کشوں کی سی ہے اور دوسری حیثیت سے وہ ظالم اور جابر بورژوا سے تعلق رکھتے ہیں۔

مزدوروں کی یہ نئی جماعت بڑی تیزی کے ساتھ دنیا کے معاشی نظام میں اہمیت حاصل کر رہی ہے اور حالات کے تیور بتا رہے ہیں کہ مستقبل کی تعمیر میں اس طبقہ کو ایک نہایت ہی اہم پارٹ ادا کرنا ہے۔ مارکس نے اپنے نظام فکر میں اس گروہ کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

مزدوروں کے اس نئے طبقے نے مارکس کے نظریہ ارتکاز مال (CONCENTRATION OF CAPITAL) کو بھی یکسر غلط ثابت کیا ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ سرمایہ اور محنت کی تفریق بڑھنے سے سرمایہ کی مقدار میں تو یقیناً اضافہ ہوگا مگر اُس کی ملکیت محدود ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ بالآخر قوم کا سرمایہ صرف چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جائے گا اور اس طرح متوسط طبقہ میں جو تھوڑی بہت خوشحالی نظر آ رہی ہے اُس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

مگر آپ صنعتی ممالک کی پچھلی تیس سالہ تاریخ پر ایک نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کیا واقعی یہی کچھ ہوا ہے جس کی مارکس نے پیش گوئی کی تھی۔ کیا دنیا کے مزدور پہلے سے غریب تر ہو رہے ہیں یا اُن کا معیارِ زندگی بڑھ رہا ہے؟ کیا متوسط طبقہ بالکل ختم ہو رہا ہے یا وہ آہستہ آہستہ دنیا کے نظامہائے معیشت میں اہمیت حاصل کر رہا ہے۔ یہ تیسری کلاس جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس نے اس مفکر کے سارے خیالات کو ایک خوابِ پریشاں ثابت کیا ہے۔

"طبقاتی تقسیم" جس پر وہ اپنے اس نظریہ کی بنیاد رکھتا ہے نہایت ہی مبہم اور غیر واضح اصطلاح ہے۔ وہ اپنی قابلیت اور ذہانت کے باوجود "طبقے" کی کوئی جامع اور مانع تعریف پیش نہ کر سکا۔ اُس نے اس مسئلہ کو اپنی کتاب "سرمایہ" کی تیسری جلد میں چھیڑا مگر اس کا کوئی معقول حل نہ پا کر اُسے بالکل ادھورا رہنے دیا۔ انسانی سماج اس قدر پیچیدہ عناصر سے مرکب ہے کہ علم کیمیا کی طرح انہیں سادہ اجزا میں الگ نہیں کیا جا سکتا، ایک خاص گروہ پر بڑی "سادہ دلی" سے "پرولتاریہ" یا "بورژوا" کا ٹھپہ نہیں لگایا جا سکتا۔ مارکس کے اپنے کلیہ کے مطابق سماج کو لاتعداد طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے چند ایک کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور بعض کے ہم آہنگ ہیں۔ یہ گروہ بندی بالکل اضافی ہے۔ ہم ابھی اس پُراسرار زندگی میں کسی نقطہ پر پہنچ کر یہ کہنے کا حق نہیں رکھتے کہ یہ ہے اصل مقام

جہاں ایک طبقہ کی حدود ختم ہوتی ہیں اور دوسرے کی سرحد کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ حالاتِ زمان و مکان کے فرق سے یہ حد بندیاں بھی بدل جاتی ہیں۔ تاریخِ انسانی اس حقیقت پر گواہ ہے کہ بسا اوقات تاریخ کی ایک معمولی کروٹ نے، چاہے وہ ذرائع پیداوار کے اعتبار سے کس قدر غیر اہم اور غیر موثر تھی، طبقاتی تقسیم کے اس سارے نقشہ کو الٹ کر رکھ دیا۔

(ج) مارکسیت کا تیسرا اصول کہ "کسی شے کی اصل قدر محنت کی وہ مقدار ہے جو اسے پیدا کرنے میں صرف ہوتی ہے" بھی بالکل غلط ہے۔ محنت کسی چیز کی پیدائش میں ایک اہم جزو کی حیثیت سے تو ضرور شامل ہوتی ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بلا شرکت غیرے اسی کی کرشمہ سازی ہے تو یہ مبالغہ آمیزی ہو گی۔ مارکس کے پیش کردہ اصول کے مطابق مختلف اشیاء کی قیمتوں میں تفاوت کی اصل وجہ اُن کی پیداوار میں محنت کی کمی بیشی ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات ایک شے کی پیدائش میں بہت کم محنت صرف ہوتی ہے مگر اس کے مقابلہ میں اُس کی قیمت زیادہ وصول ہوتی ہے۔ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بعض اشیاء بڑی محنت کے صرف کے بعد پیدا کی جاتی ہیں، مگر زمانہ کی ایک گردش اُن کی قدر کم کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کی قدر کا انحصار صرف محنت پر ہی نہیں بلکہ طلب کی کشش پر بھی ہے، مارکس اسے یکسر نظر انداز کر دیتا ہے۔

اسی طرح اُس کا نظریہ "قدرِ زائد" بھی بالکل ڈھکوسلہ ثابت ہوا ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قدر زائد حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ "غریب مزدور" کی محنت سے ناجائز انتفاع ہے تو پھر سرمایہ داروں کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ مشینری کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ مزدور بھرتی کریں۔ کیونکہ ان کی محنت سے انہیں زیادہ منافع کی امید ہے۔ آپ خود غور کریں کہ کیا دنیا میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ کیا سرمایہ دار اپنے منافع کے حصول کے لیے انسانوں کو کارخانوں سے نکال نکال کر وہاں مشینوں سے کام نہیں لے رہا۔

(د) سب سے آخر میں مارکس کے نظریہ ریاست پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ اس میں اس مفکر نے اپنے نظریہ کو برحق ثابت کرنے کے لیے کن کن حقائق سے چشم پوشی کی ہے۔ مارکس کے نزدیک ریاست

جبر و استبداد کا ایک ایسا طاقتور ادارہ ہے جس کی مدد سے سرمایہ دار غریب، بے کس اور مفلوک الحال پرولتاریہ کو لوٹتے ہیں۔ اس ادارہ کا مقصد کمزوروں کے حقوق کی پاسبانی کرنا نہیں بلکہ اس کی غرض و غایت صرف حکمران طبقہ کے ناجائز مفادات کی حفاظت اور نگرانی کرنا ہے۔ اس کے اندر رہتے ہوئے اگر کوئی فرد یا گروہ عدل و انصاف کی توقع کرتا ہے تو وہ جنت الحمقا میں بستا ہے، کیونکہ اس کے قوانین کی تدوین اس طریق سے کی جاتی ہے جس سے "بے بسوں" کو امراء کے پنجۂ استبداد میں جکڑا جا سکے اور وہ ان سے جس طرح چاہیں اپنی "بہتری" کے لیے کام لے سکیں۔ اب اگر انسانیت ظلم سے نجات چاہتی ہے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ اقتدار کو سرمایہ داروں سے چھین کر محنت کشوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ یہ "پاکباز" اور "بے غرض" لوگ اقتدار کے تخت پر متمکن ہوتے ہی انفرادی ملکیت کا خاتمہ کر کے طبقاتی تقسیم کو یکسر مٹا دینگے اور اس طرح فساد کی وہ اصل جڑ کٹ جائے گی جس سے ریاست کا یہ شجرِ خبیث اپنی خوراک حاصل کرتا ہے۔ کچھ دیر زندہ رہنے کے بعد یہ درخت خود بخود سوکھ کر پیوند خاک ہو جائیگا اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کے سائے میں رہنے والے بورژوا اس کا "سایۂ عاطفت" اٹھ جانے کے بعد موت کا جام پی لینے پر خود بخود مجبور ہو جائیں گے۔ یہ ہے وہ راستہ جس پر گامزن ہو کر مسکین پرولتاریہ" ان "بھیڑیوں" سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ تجویز بظاہر بڑی جاذب نظر ہے۔ ہمارا ہر روز کا مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے کہ جب کبھی ایک سماج کے مختلف طبقوں میں کوئی کشمکش نمودار ہوئی تو ریاست کی مشینری، اس کی بندوقوں اور توپوں نے غریبوں کو نہایت بیدردی سے کچل کر رکھ دیا اور ہمیشہ حکمران طبقوں کی حفاظت کی۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ ادارہ ہمیشہ سے ظالموں کا پشت پناہ رہا ہے اور اس کے ذریعہ کبھی سماج میں عدل و انصاف قائم نہیں ہوا۔ اسی تاریخ میں ہمیں کئی ایسے روشن ادوار ملتے ہیں جن میں اس ریاست نے امراء کا آلۂ کار بننے کی بجائے غریبوں اور کمزوروں کے حقوق کی نگہداشت کی۔ قریش اسی لیے آخری دم تک مسلمانوں سے برسرِ پیکار رہے کہ اسلامی ریاست اس معاشرتی اور سیاسی تفوق کو مٹا رہی تھی جو ان لوگوں کو اسلام کے آنے سے پہلے معاشرے میں حاصل تھا۔ اسلامی ریاست کا وجود برسرِ اقتدار

لوگوں کے مفادات کی حفاظت کے لیے نہ تھا بلکہ اس کی غایت سماج کے مختلف طبقوں میں مساوات کو قائم کرنا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ اپنی حکومت کا بنیادی مقصد بتاتے ہوئے فرماتے ہیں :

| | |
|---|---|
| والضعیف فیکم قوی عندی حتی ارجع علیه حقه ان شاء الله والقوی فیکم ضعیف عندی حتی اخذ الحق منه ان شاء الله | اور تم میں جو بے اثر ہیں۔ میرے نزدیک وہ با اثر ہیں یہاں تک کہ میں ان کا حق واپس دلا دوں ان شاء اللہ اور تم میں جو با اثر ہیں وہ میرے نزدیک بے اثر ہیں۔ یہاں تک کہ میں ان سے دوسروں کا حق وصول کر لوں ان شاء اللہ |

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے :۔

| | |
|---|---|
| والله ما منکم اقوی عندی من الضعیف حتی اخذ له الحق ولا اضعف عندی من القوی حتی اخذ الحق منه | خدا کی قسم تم میں سے کمزور میرے نزدیک سب سے زیادہ طاقتور ہے جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں۔ اور تم میں سے طاقتور میرے لیے ضعیف تر ہے جب تک اس سے میں حق وصول نہ کر لوں۔ |

اس ضمن میں یہ بھی یاد رہے کہ یہ اصول صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں تھے بلکہ ان کا اطلاق ہر اس فرد پر ہوتا ہو جو اسلامی ریاست کے اندر رہتا تھا۔

ان اقوال کا بار بار مطالعہ کیجئے اور پھر دیکھیے کہ کیا ریاست کا مقصد ظالموں اور جفا کاروں کے حقوق کی نگہبانی کرنا تھا یا اس کا نصب العین ان طبقوں کی طاقت کو کمزور کر کے بے سہارا افراد کو ان کے چنگل سے آزاد کرنا تھا۔ یہ دو اقوال میں نے بطورِ مثال پیش کیے ہیں۔ اگر آپ تاریخ کی ورق گردانی کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کس محنت و جانفشانی سے ان بزرگوں نے سماج میں ناجائز انتفاع کو روکا اور ہر مستحق کو اُس کا حق دلوا کر چھین لیا۔ تاریخ کے صفحات میں جب تک اس دور کے نشانات باقی ہیں اس وقت تک مارکس کے نظریۂ ریاست کی صداقت مشکوک رہے گی۔

اس نظریہ کی صحت کا ایک اور بنا پر بھی اقرار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم چند لمحوں کے لیے یہ تسلیم کرتے

ہیں کہ پرولتاریہ ذاتی ملکیت کو بالکلیہ ختم کر کے اپنی ایک ریاست کی بنیاد رکھتا ہے۔ اس کے انتظام و انصرام میں کوئی بورژوا شریک نہیں کیا جاتا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ مزدور طبقہ جو اب حکمران بھی ہے کن اخلاقی صفات سے متصف ہو کر سلطنت کا نظم چلائے گا۔ ظاہر بات ہے کہ اس کے سامنے صرف ایک مقصد ہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مادی آسائش حاصل کی جائے۔ کیونکہ اشتراکی تحریک ابتداہی سے انسان کے انہی جذبات کو ابھارتی ہے اور دوسرے تمام تصورات و محرکات کو یہ کہہ کر مٹاتی ہے کہ یہ سب بورژوا کے خود ساختہ تصورات ہیں جو اس کے طبقاتی مفاد کی حفاظت کے لیے گھڑے گئے ہیں۔ اس بنا پر کیا یہ ناممکن ہے کہ پرولتاریہ کے یہ حکمران افراد عام لوگوں سے کہیں زیادہ معاشی اغراض کے بندے اور مادی خوشحالی کے پرستار ہوں اور اس لحاظ سے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سامان عیش سمیٹنے کی فکر کریں۔ البتہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس حکومت میں فائدہ اٹھانے والے اور استحصال (EXPLOTAION) کرنے والے افراد خود "مظلوم پرولتاریہ" کے ایک خاص طبقہ پر مشتمل ہوں گے اور اپنے ہی بھائی بندوں کو اپنی اغراض کا آلۂ کار بنائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہماری مادی خواہشات پر اخلاق کی گرفت مضبوط نہیں ہوتی اس وقت تک زندگی میں لوٹ کھسوٹ ختم نہیں کی جاسکتی۔ نظام کار خواہ "پرویز" کے ہاتھ میں ہو یا "کوہکن" کے ہاتھ میں، اگر وہ اخلاق سے عاری ہیں تو دونوں سے ایک جیسے اعمال سرزد ہوں گے۔

نظام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اس سلسلہ میں یہ بھی ذہن نشین رہے کہ انسان کے سینے میں پلنے والے جذبات میں ایک زبردست جذبہ "نمائش" بھی ہے۔ انسان اپنے ابنائے جنس میں اپنی فوقیت اور برتری کے اظہار کا خواہشمند ہوتا ہے اور اسی کے لیے وہ دولت، ثروت اور اقتدار کو حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اس جذبہ کی سب سے بہتر طور پر تسکین اقتدار کے نشہ سے ہوتی ہے۔ دورِ جدید میں افراد اور مختلف گروہ اگر دولت اور ذرائع پیداوار پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے زیادہ فکرمند نظر آتے ہیں،

تو اُس کی وجہ صرف یہی ہے کہ سرمایہ اقتدار کے حصول کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ یہ مقصد اگر کسی اور طریق سے حاصل ہو سکتا تو انسان اسی کو اختیار کر لیتا۔ ان حالات میں جب کہ اشتراکی حضرات مادی زندگی اور اس کے فوائد و لذائذ سے بلند تر کسی چیز کا تصور تک نہیں کر سکتے، یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ از خود تخت و تاج سے دست بردار ہو جائیں گے۔

مارکس کا خیال تھا کہ ریاست آہستہ آہستہ مٹ جائے گی مگر حالات کی رفتار صاف بتا رہی ہے کہ یہ ادارہ مزدوروں کے اپنے ہاتھوں سے مستقبل میں آج کی نسبت زیادہ مستحکم اور مضبوط صورت اختیار کرے گا۔ سٹالن کے ہاتھوں ٹراٹسکی کی بربادی اور مالنکوف کے ہاتھوں بیریا کا قتل اسی ہوس اقتدار کا نتیجہ ہے۔ روس کی چند سالہ تاریخ اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ سٹیٹ کا دائرۂ اختیار روز بروز بڑھ رہا ہے اور اسی طرح حکمران طبقہ کو غربا کے لوٹنے کے لیے زیادہ سے زیادہ قوت فراہم ہو رہی ہے۔ (باقی آئندہ)

# رسائل و مسائل

## مزاج شناسِ رسول

سوال :۔ مرزائی، منکرینِ حدیث اور بعض دوسرے لوگ اس بات کا بہت چرچا کرتے ہیں کہ مولانا مودودی نے مزاج شناسِ نبوت ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور کہا ہے کہ اس مزاج شناسی کے بل پر وہ ذخیرۂ احادیث میں سے جس حدیث کو چاہیں صحیح اور جس کو چاہیں غلط قرار دے سکتے ہیں۔ ان لوگوں کی طرف سے حال میں یہ بات بھی پھیلائی گئی ہے کہ جماعت اسلامی کے ارکان اور ہمدرد بھی مولانا مودودی کے اس دعوے کو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ ان معترضین کے بقول، پنجاب کی تحقیقاتی عدالت میں مولانا اصلاحی صاحب نے بھی اس دعوے کو مان لیا ہے۔ اعتراض کرنے والوں کا کہنا یہ بھی ہے کہ یہ دعویٰ ایک طرح کا ادّعائے نبوت ہے کیونکہ مرزا غلام احمد صاحب نے بھی یہی کہا تھا کہ میں احادیث کے ڈھیر میں سے جسے چاہوں لے سکتا ہوں اور جسے چاہوں رد کر سکتا ہوں۔ براہِ کرم اس بارے میں اصل حقیقت سے مطلع فرمائیں تاکہ صحیح رائے قائم کی جا سکے۔

جواب :۔ آپ نے جس بہتان طرازی کا ذکر کیا ہے اس سے ہم ناواقف نہیں ہیں۔ جماعت اسلامی کے خلاف فتنہ پردازی کی وسیع مہم کا ایک شوشہ یہ بھی ہے۔ چونکہ آپ کا سوال یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس بارے میں پوری معلومات آپ کے سامنے نہیں ہیں اس لیے آپ کے اطمینان کی خاطر مختصر جواب دیا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے مولانا مودودی کی وہ دو عبارتیں نقل کر دینا مناسب ہوگا جسے بنائے دعویٰ ٹھہرایا گیا ہے۔ وہ "تفہیمات" کے دو مضامین "قرآن و حدیث" اور "مسلک اعتدال" کی ذیل کی عبارتیں ہیں :۔

" حدیث کو اصول درایت پر وہی شخص جانچ سکتا ہے جس نے قرآن کا علم حاصل کر کے اسلام کے اصول اولیہ کو خوب سمجھ لیا ہو اور جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرے کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرت مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج شناس ہو جاتا ہے اور اسلام کی روح اُس کے دل و دماغ میں بس جاتی ہے۔ پھر وہ ایک حدیث کو دیکھ کر اول نظر میں سمجھ لیتا ہے کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرما سکتے تھے یا نہیں یا آپ کا عمل ایسا ہو سکتا تھا یا نہیں ؟"

" معاذ اللہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ لوگ (یعنی ائمہ مجتہدین) کسی حدیث کو صحیح جان کر اس سے انحراف کرتے تھے۔ نہیں، بلکہ اصل معاملہ یہ تھا کہ ان کے نزدیک صحتِ حدیث کا مدار صرف اسناد پر نہ تھا۔ بلکہ اسناد کے علاوہ ایک اور کسوٹی بھی تھی جس پر وہ احادیث کو پرکھتے تھے اور جس حدیث کے متعلق ان کو اطمینان ہو جاتا تھا کہ یہ حقیقت سے اقرب ہے اس کو قبول کر لیتے تھے خواہ وہ خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے مرجوح ہی کیوں نہ ہو۔

یہ دوسری کسوٹی کونسی ہے؟ ہم پہلے بھی اشارۃً اس کا ذکر کر چکے ہیں کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقُّہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسول کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بحیثیت مجموعی شریعتِ حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتے ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کونسی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذاتِ نبوی کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے

ساتھ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کونسا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کونسی چیز سنت نبوی سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت میں کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے "

اِن عبارتوں سے تین باتیں بالکل عیاں ہیں۔ ایک یہ کہ مصنف اپنے بارے میں یہ دعویٰ نہیں کر رہا کہ وہ مزاج شناس نبوت ہے بلکہ وہ فن حدیث کے ائمہ کے بارے میں ایک عام اصول بیان کر رہا ہے۔ دوسری بات یہ بیان ہوتی ہے کہ کتاب اللہ، سیرت نبوی اور آنحضورؐ کے ارشادات کے وسیع مطالعے اور مسلسل غور و تدبر سے ایسی مناسبت و مہارت پیدا ہو جاتی ہے کہ طالب حدیث اپنے ذوق سلیم اور وجدان صحیح کی مدد سے ایک حدیث کے الفاظ و معانی کو دیکھ کر یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ یہ نبی کا کلام ہو سکتا ہے یا نہیں۔ تیسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ اس طرح کا ذوق نقد حدیث کا واحد معیار نہیں ہے، بلکہ احادیث کے جانچنے میں جن متعدد ذرائع سے کام لیا جاتا ہے ان میں سے ایک ذریعہ یہ بھی ہے اب ظاہر ہے کہ جو شخص ان عبارتوں سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ یہ ساری بحث مصنف نے اس لیے کی ہے کہ وہ مزاج شناسی نبوت کا کوئی منصب وضع کر کے اس پر قابض ہونا چاہتا ہے تو اس شخص کے کذب و افترا اور دجل و تلبیس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

یہاں دو معقول سوال البتہ ضرور کیے جا سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ فی الواقع محدثین نے ایسی بات کہی ہے یا مولانا مودودی نے بلا وجہ ان کی طرف اسے منسوب کر دیا ہے، دوسرا یہ کہ اگر محدثین کی یہ رائے ہے تو یہ صحیح ہے یا غلط ہے؟ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ تمام ائمہ حدیث نے اس اصول کو بیان کیا ہے۔ اور اس فنی ذوق کی بنا پر وہ بعض احادیث کے بارے میں کہہ دیتے ہیں کہ ھذا الحدیث علیہ ظلمۃ (ومتنہ مظلم) (اس حدیث پر تاریکی چھائی ہوئی ہے یا اس کا متن تاریک ہے) بعض اوقات وہ کسی حدیث کو دیکھ کر کہتے ہیں " طبیعت اسے قبول کرنے سے ابا کرتی ہے "۔ یہاں زیادہ

آراء کا نقل کرنا تو محال ہے، البتہ چند حوالے ہم پیش کیے دیتے ہیں جنہیں حاکم نے اپنی مشہور کتاب "معرفۃ علوم الحدیث" میں نقل کیا ہے۔ ابن جوزی فرماتے ہیں: "منکر حدیث سنتے ہی عالم حدیث کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور قلب متنفر ہونے لگتا ہے"۔ ربیع ابن خثیم کا قول ہے کہ "اکثر حدیثوں میں روز روشن کا سا نور ہوتا ہے جس کے ذریعے سے ہم انہیں پہچان لیتے ہیں اور بعض احادیث پر رات کی سی تاریکی طاری ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہمیں ان کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ ابن دقیق العید کہتے ہیں "محدثین بعض اوقات کسی حدیث کے موضوع ہونے کا فیصلہ الفاظ کی بنا پر کرتے ہیں"۔ اور بلقینی اس کی تشریح یوں کرتے ہیں: "اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک خادم اپنے آقا کی سالہا سال تک خدمت کرتے کرتے اس کی پسند و ناپسند سے گہری واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔ اب ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ تمہارا آقا فلاں چیز ناپسند کرتا ہے حالانکہ خادم جانتا ہوتا ہے کہ میرے آقا کو یہ شے پسند ہے، چنانچہ وہ فوراً اس کی تکذیب کر دیتا ہے"۔

ان حوالوں سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہ حقیقت محدثین کے ہاں بالکل معروف اور مسلّم ہے یہی وجہ ہے کہ منکرین حدیث کے ترجمان "طلوع اسلام" نے جب شروع شروع میں مولانا مودودی کی عبارت کو اپنے ہاں نقل کیا تھا تو حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری نے طلوع اسلام ہی میں اس پر لکھا تھا کہ یہ بات مودودی صاحب نے نرالی نہیں کہی بلکہ محدثین سارے یہی کہتے چلے آتے ہیں اور ان کا یہ کہنا لوگوں کو خالص شخصیت پرستی کی دعوت دینا ہے۔ ابتداء میں بات اتنی ہی کہی گئی تھی لیکن جو مسائل سلف سے خلف تک مسلّمات کے طور پر منتقل ہوتے چلے آئے ہیں، منکرین حدیث اور قادیانی اور اسی قماش کے دوسرے لوگ جب تک ان مسلّمات کو جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی ایجاد قرار نہ دے لیں اور پھر جماعت اسلامی کو اچھی طرح کوس نہ لیں، اس وقت تک انہیں مزا ہی نہیں آتا۔ قتل مرتد، رجم زانی محصن، ملک یمین، ملکیت شخصی، ان میں سے آخر کونسا مسئلہ ایسا ہے جس کے بارے میں جماعت اسلامی نے کوئی ایسی بات کہی ہو جو چودہ صدیوں سے مسلمانوں میں متفق علیہ اور مجمع علیہ نہ رہی ہو۔

اب دوسرا سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ائمہ حدیث کا یہ قول صحیح ہے یا نہیں کہ کثرت مطالعہ سے حدیث کی معرفت کا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ کائنات میں ہر شے کی اچھی، بُری

کھوٹی، کھری، اعلیٰ، ادنیٰ مختلف اقسام پائی جاتی ہیں۔ ان اشیاء میں سے کسی شے کے استعمال میں اگر مداومت اور مزاولت کی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اصلی اور نقلی کی پہچان کی ایک فطری صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور نگاہ کسوٹی کا کام دینے لگتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اور علم، عقل، تجربہ، مشاہدہ تمام اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں اور اس حقیقت کا منکر وہی شخص ہو سکتا ہے جو بالکل ہٹ دھرم ہو اور جو حدیث کے مقام اور رسالت کے منصب کا اسی طرح انکار کرے جس طرح کا انکار دونوں مذکورۂ بالا گروہ کرتے ہیں۔ یہ خیال کرنا بھی صحیح نہیں ہے (جیسا کہ جیراجپوری صاحب نے کہا ہے) کہ یہ معیار خالصتہً شخصی اور ہر محدث کے انفرادی ذوق کا آئینہ دار ہو گا۔ چونکہ احادیث کا ایک ہی ذخیرہ ہے جو اس ذوق کی تخلیق و تربیت کرتا اور اسے پروان چڑھاتا ہے۔ اس لیے فی الجملہ اس ذوق و وجدان میں ہم آہنگی اور یک جہتی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اگر کہیں اختلاف ہو بھی تو چونکہ یہ ذوق نقدِ حدیث کا واحد معیار نہیں ہے اس لیے یہ خدشہ باقی نہیں رہتا کہ تنہا اس کے بل پر ہر محدث کا معیار انفرادی اور دوسرے محدثین سے مختلف ہو جائے گا۔

جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے کہ مولانا اصلاحی صاحب نے تحقیقاتی عدالت میں مولانا مودودی کے دعوائے مزاج شناسیٔ رسول کو تسلیم کیا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ قادیانی وکلاء عدالت میں گواہوں سے ہر طرح کے اُلٹے سیدھے سوال کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ مولانا اصلاحی صاحب کی شہادت کے دوران میں انہوں نے آپ پر یہ سوال کیا تھا کہ مزاج شناسِ رسول کی تعریف کیا ہے۔ مولانا اصلاحی صاحب نے اس کا جواب یہ دیا کہ مزاج شناسِ رسول وہ شخص ہے جو ایک نبی، غیر نبی اور جھوٹے نبی کے کلام میں امتیاز کر سکے۔ قادیانی وکیل نے اپنے مخصوص علم کلام سے کام لیتے ہوئے دوسرا سوال یہ کیا کہ کیا آپ مولانا مودودی کو مزاج شناسِ رسول سمجھتے ہیں۔ مولانا اصلاحی صاحب نے جواب میں فرمایا کہ "میرا حُسنِ ظن اُن کے بارے میں یہی ہے کہ وہ ایک نبی، غیر نبی اور جھوٹے نبی کے کلام میں امتیاز کر سکتے ہیں"۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس جواب پر منکرینِ حدیث اور منکرینِ ختمِ نبوت کو چھوڑ کر اور کون معقول آدمی اعتراض کر سکتا ہے۔ کیا مولانا اصلاحی اس کے جواب میں یہ کہتے کہ ان کا سوئے ظن مولانا مودودی کے بارے میں یہ ہے کہ وہ سچے اور

جھوٹے نبی کے کلام میں تمیز نہیں کر سکتے۔؟

مرزا غلام احمد اور مولانا مودودی کی عبارات میں مماثلت پیدا کرنے کی توقع بھی انہی لوگوں سے ہو سکتی ہے جو مقام رسالت سے قطعاً ناآشنا ہوں۔ مرزا صاحب نے جو دعویٰ کیا ہے وہ یہ ہے کہ نبوت و رسالت کا منصب حاصل کر لینے کی وجہ سے اللہ نے انہیں ایسا علم دے دیا ہے کہ وہ جس حدیث کو چاہیں اخذ کریں اور جسے چاہیں رد کر دیں۔ یہی موقف مرزا صاحب کا سارے احکام شریعت کے بارے میں ہے خواہ ان کا ماخذ قرآن ہو یا حدیث۔ جس شخص کے دماغ میں ذرہ بھر عقل اور دل میں رائی کے برابر خوفِ خدا ہو وہ اس بات کا جوڑ آخر اس بات سے کیسے ملا سکتا ہے جسے مولانا مودودی نے ایک اصولِ درایتِ حدیث کے طور پر نقل کیا ہے اور جسے تمام ائمۂ فن مانتے چلے آئے ہیں۔

---

# چند اشکالات

سوال:- میں اکثر اوقات اس پر غور کیا کرتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ مرزا غلام احمد کو اپنے گمراہ کن مشن میں اس قدر کامیابی حاصل ہوئی۔ مجھے مرزا صاحب کی کامیابیوں کا سلسلہ لاتناہی نظر آتا ہے اور جس وقت مرزا صاحب کے مخالفین کی نامرادیوں پر غور کرتا ہوں تو وہ بھی بے حد و حساب نظر آتی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

ایک شخص خدا اور اس کے رسول کے مقابلہ پر کھڑا ہوتا ہے، نائبینِ رسولؐ کو چیلنج کرتا ہے کہ تم سب مل کر بھی میرے مشن کو فیل نہیں کر سکتے، کیونکہ خدا کی تائید میرے شاملِ حال ہے۔ تم جب بھی میرے مقابلہ پر آؤ گے، ہر مرتبہ ذلیل و نامراد ہوتے رہو گے، اور یہی میرے نبی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ مرزائیوں کی حفاظت کے سامان غیب سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک تازہ مثال دیکھیے کہ جھمپیر کے حادثہ میں نجانے کتنے مسلمان لقمۂ اجل ہو گئے لیکن مرزا صاحب کے ایک ممتاز پیرو کو خدا تعالیٰ نے بال بال بچا لیا۔ دوسری طرف مرزائیوں

کے مخالفین کی تباہی کے سامان بھی غیب سے ظہور میں آتے ہیں۔ جس کی ایک مثال لاہور کا مارشل لاء ہے۔ ذرا سچے رسولؐ کی ختم نبوت کی حفاظت کرنے والوں کی ناکامیاں اور تباہیاں سامنے لائیے! کس قدر زوردار تحریک اٹھی تھی اور کیسے ہمیشہ کے لیے ختم ہو کے رہ گئی۔

پھر، اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو خدا پر جھوٹ بولے۔ ایک دوسری آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "اے نبی! اگر تم ہماری طرف سے ایک ذرا سا بھی جھوٹ گھڑ کر بیان کرو تو ہم تمہاری گردن پکڑ لیں"۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس سے پہلے کسی شخص نے خدا پر اتنا بڑا جھوٹ بولا ہو اور پھر وہ اس طرح اپنے مشن میں کامیاب بھی ہوا ہو۔

گذشتہ سال جو کچھ لاہور میں ہوا، کیا وہ سب کچھ اتفاقی طور پر ہو گیا؟ خدا کی مرضی اس میں شامل نہیں ہے کہ علماء کو جیل اور پھانسی، اور . . . ؟

امید ہے کہ اس سے آپ میری الجھن کو سمجھ لیں گے اور میری رہبری فرمائیں گے۔

**جواب** - یہ ایک دلچسپ سوال ہے، مگر اپنے اندر اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس طرح کے دھندلے دھندلے شکوک و شبہات بہت سے دلوں میں ہیں، اور خود مرزائی حضرات بھی اپنی تبلیغ میں یہ شکوک و شبہات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یہ سوال چند اصولی حقیقتوں کی وضاحت چاہتا ہے، جنہیں ہم ایک مناسب ترتیب سے سائل کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ خدا کے دیے ہوئے علمِ حقیقت کی رُو سے حق و باطل کا معیار یہ نہیں ہے کہ کس موقعے پر کون مرا اور کون بچ نکلا، کون ابتلاء میں سے گذر رہا ہے اور کون مزے میں ہے۔ اگر یہ معیار ہوتا سچ اور جھوٹ کا، تو پھر مستقل سنت اللہ یہ ہوتی کہ موت فوت، حادثے، بیماری، قحط اور مصائب و شدائد کا شکار ہمیشہ اہلِ باطل ہوا کرتے، اہلِ حق کا کبھی بال بیکا نہ ہونے پاتا۔ آگ لگتی، گاڑیاں ٹکراتیں، بسیں الٹتیں، بجلیاں گرتیں، اور ایمان دار اور نیک لوگ بچا لیے جاتے، صرف کفار و فساق کا خاتمہ ہو جایا کرتا۔ اہلِ ایمان اور نیک لوگوں کو اوّل تو سیدھے زندہ آسمان پر اٹھا لیا جاتا، ورنہ پھر آخر انہیں موت آتی بھی تو بسترِ سکون و راحت پر آتی۔ حادثات روز آپ کے سامنے ہوتے ہیں اور ان میں

مسلم اور غیر مسلم، شریف اور شریر، ظالم اور مظلوم ہر طرح کے لوگ مرتے بھی ہیں، زخمی بھی ہوتے ہیں اور بچ بھی نکلتے ہیں۔

ہم یہ ضرور مانتے ہیں کہ نظامِ مشیت کے تحت جو ادنیٰ سے ادنیٰ طبعی حادثات انسانی زندگی میں واقع ہوتے ہیں ان میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار حکمتیں اور مصلحتیں کارفرما ہوتی ہیں اور کوئی چیز بھی اندھا دھند طریق سے واقع نہیں ہوتی۔ لیکن یہ بات کہ یہ حوادث کسی کو اپنی لپیٹ میں لے کر اور کسی کو زندہ و سلامت چھوڑ کر اس کے برسرِ حق یا حق سے منحرف ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں، ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی تردید قرآن خود کرتا ہے۔ اور ایک جگہ نہیں، بار بار کرتا ہے۔ سوائے اُس عذابِ الٰہی کے عظیم حادثہ کے جو اپنی پوری شرائط کے ساتھ ظہور پا کر کسی قوم کی قوم کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے اور جس کی لپیٹ سے بجز مومنین صالحین کے کوئی بچ کے نہیں نکل سکتا، اور کسی بھی حادثے کا شکار ہو جانا یا اس سے بچ نکلنا کسی کے ایمان و کفر اور کسی کی راستی و ناراستی کو نکھار دینے والا معیار نہیں ہے۔ لوگوں کا مرنا اور بچ نکلنا، بیمار پڑنا اور تندرست ہونا، کاروبار میں ترقی کر جانا یا لپسپا ہونا، فراخ روزی پا لینا یا تنگ دستی سے دوچار ہو جانا، کوئی بازی جیت لینا یا کسی میں ہر جانا، ان کے عقیدہ و عمل اور ان کے فکر و کردار کی صحت و عدمِ صحت کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اس بارے میں اللہ کا قانون مہلت کا قانون ہے۔ قرآن اسے چند لفظوں میں یوں بیان کرتا ہے کہ

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ (بنی اسرائیل - ۲۰)

ہم سب کے سب لوگوں کو، اُن کو بھی (من کان یرید العاجلۃ) اور ان کو بھی (من اراد الاخرۃ) مدد دیتے ہیں، تیرے پروردگار کی عنایت میں سے۔

یعنی ہر ایک کے لیے، چاہے اس کا عقیدہ و خیال اور مذہب و کردار کوئی ہو، میدانِ تگ و تاز کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ اللہ نے مہلت کے دائرے میں کہیں بھی اپنے کسی قانون کی روک ایسی نہیں ڈالی جو باطل نظریات اور فاسد کردار رکھنے والوں کے لیے امتیازی طور پر آگے بڑھنے میں حائل ہو۔ کوئی جدھر بڑھنا چاہے بڑھتا جائے اور جہاں تک بڑھ سکتا ہو بڑھے۔ ایمان اور کفر، بھلائی اور برائی، راستی اور

ناراستی، عدل اور ظلم، طاعت اور استکبار، حق پرستی اور نفس پرستی کی دو گونہ راہیں ہر ایک کے لیے کھلی ہیں۔ اور سامنے کتبہ لگا ہے کہ من شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر۔

یہ صورت اگر نہ ہوتی بلکہ کفر اور ناراستی اور ظلم کا رویہ اختیار کرنے والوں کو طبعی حوادث کے ذریعے دھر لیا جاتا تو خود قرآن ہی بتاتا ہے کہ انسان کی وہ آزادی انتخاب ختم ہو جاتی جو اسے ذمہ دار ہستی بنا کر قابل سزا یا سزاوار جزا بناتی ہے۔ پھر تو نظام تقدیر کے تحت "اکراہ فی الدین" کی حالت قائم ہو جاتی کہ جیسے شجر و حجر اور مہر و قمر اللہ کے حضور طوعًا و کرہًا مُسلم بنے کھڑے ہیں، انسان بھی بلا ارادہ و انتخاب مُسلم و مطیع ہوتا۔

بات اتنی ہی نہیں کہ آدمی کو فکر و عمل کی دنیا میں دونوں سمتوں میں آگے بڑھنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی قرآن کی واضح کردہ حقیقت ہے کہ جو لوگ کفر اور بغاوت اور انحراف اور استکبار کی راہ اختیار کر لیتے ہیں ان کو اور زیادہ چھوٹ ملتی ہے۔ جیسے کہ فرمایا: وَالَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِیْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ ۝ (الاعراف ۱۸۲، ۱۸۳) دوسری جگہ فرمایا: فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ ؕ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِیْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَیْدِیْ مَتِیْنٌ (القلم ۴۴-۴۵) مزید صراحت کے لیے ملاحظہ ہو: مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِیْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِیْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ (بنی اسرائیل-۱۸)

جیسے ماہی گیر کانٹا نگل جانے والی مچھلی کو ڈور ڈھیلی چھوڑ چھوڑ کر تگ و تاز کا موقع دیتا ہے ایسے ہی قانون مشیت کا معاملہ گمراہ مفسدین کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ سرکش مچھلیاں بظاہر پانی میں سَل سَل کرتی دُور تک جا پہنچتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ ہماری تگ و تاز میں کون رکاوٹ بن سکتا ہے، لیکن حال یہ ہوتا ہے کہ کانٹا حلق کو بندھ چکا ہوتا ہے اور ڈور ایسے شکاری کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو شکار کے گہرے داؤں کو کام میں لا رہا ہوتا ہے۔ سرکشوں اور گمراہوں کے لیے الٰہی مشیت کا خاص رویہ ہے کہ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی، یعنی جدھر وہ بہک کے چل کھڑے ہوتے، خدا کے قوانین اُدھر ہی ان کو آگے اور آگے لیے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ نوبت نصلیہ جہنم تک پہنچتی ہے۔

دوسری یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ مسلمانوں کے عام کرب و اضطراب کے باوجود قادیانیوں کا ان پر مسلط رہنا اور ان سے اپنے اجتماعی وجود کو نجات دلانے میں ان کا ناکام ہونا اپنے پیچھے چند ایسے نمایاں وجوہ رکھتا ہے کہ جن سے ہم لوگ چاہے کتنا ہی صرفِ نظر کریں، الٰہی قانون بہرحال ان کو سامنے رکھ کر کام کرتا ہے۔ وہ نمایاں وجوہ یہ ہیں:۔

۱۔ جس سچے نبیؐ کو مسلمان ملتے ہیں اور آخری نبیؐ مانتے ہیں، اور جس کی شمعِ ناموس کے پروانے بن بن کر قربانیاں دیتے نظر آتے ہیں، اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں اسی نبیؐ کی نورانی ہدایت، اس کی سچی تعلیم، اس کے لائے ہوئے نظامِ فلاح سے کھلا کھلا انحراف کرتے ہیں، اس نبیؐ کی سنت کی دھڑتے سے مخالفت کرتے ہیں، اس کے سکھائے ہوئے اصولِ حیات کا مذاق اڑاتے ہیں اس کی پیش کردہ معاشرت و تہذیب کے خلاف دلیل بازی کرتے ہیں، اس کے دین کے علمبرداروں کو کچلتے ہیں اور احیائے اسلام کی تحریکوں پر تشدد کرتے ہیں۔

پھر کیا بعید کہ اس تضاد پر ایک سزا کے طور پر ان کے اندر سے مشیت نے ایک خاص فتنے کو ابھرنے کا اور ان کے اپنے معاشرے میں پھلنے پھولنے کا موقع دیا ہو۔ کیا یہ کوئی معمولی ابتلاء ہے کہ ایک قوم اپنی آزادانہ ریاست رکھتے ہوئے اس کرب و اضطراب سے نجات نہ پاسکے جس میں وہ پچاس برس سے مبتلا ہے۔ خدا کے بھیجے ہوئے نبیؐ صادق کے مقابلے میں قوم کی شانِ انحراف یقیناً یہ رنگ بھی لاسکتی ہے کہ وہ جعلی نبوت کے فتنے کو بھگتے۔

۲۔ آپ دیکھتے ہیں کہ پاکستان کی مسلمان قوم جو قادیانیوں کو اقلیت قرار دلوا کر ان سے پیچھا چھڑانے کی جد و جہد کرتی ہے، خود اسی کا پالا پوسا ملحد اور مذہب دشمن عنصر ہے جو قادیانیوں کی سرپرستی کرنے پر بضد ہے۔ یہ عنصر معاشرے میں جو غلبہ و اثر رکھتا ہے وہ اسی پاکستانی قوم کے تعاون سے اسے حاصل ہوا ہے، اور اسی کے تعاون سے قائم ہے۔ گویا یہ قوم ایک ہاتھ سے جس جھاڑ کے کانٹوں سے اپنا دامن چھڑانا چاہتی ہے، دوسرے ہاتھ سے اسی کی جڑوں کو پانی بھی دیتی ہے۔ ایسی دو رنگی کی روش کا مظاہرہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کے ہاں سے بجز اس کے اور کونسا

جواب مل سکتا ہے جو اب تک ملا ہے۔

۳- پھر حصولِ مقصد کے لیے اب تک جو جدوجہد ہوئی ہے، اس کے بارے میں جرأت کے ساتھ یہ تلخ حقیقت ہمیں مان لینی چاہیے کہ اس میں ایسے پہلو بہت بڑے پیمانہ پر موجود تھے جن کا روادار خود اسلام نہیں اور جن سے اللہ اور اس کا رسول کبھی راضی نہیں ہو سکتے۔ اس جدوجہد میں اخلاص کے ساتھ مفاد پسندی، راستی کے ساتھ چالبازی، ایثار کے ساتھ ریا، اسلامی کردار کے ساتھ پستیٔ اخلاق، عزیمت کے ساتھ بزدلی اور نظم کے ساتھ ہُڑبونگ کی بہت بڑی آمیزش موجود تھی۔ اندریں حالات جس خدا نے اُحد اور حنین میں امت کی بہترین ہستیوں کی ذراسی بشری لغزشوں پر شدید گرفت کی تھی، وہ اس جدوجہد ہی کے بارے میں اپنی سنت کیوں بدلنے لگا!

یہ تینوں وجوہِ وبال اگر سامنے رکھ کر آپ از سرِ نو مسئلہ پر غور فرمائیں تو یقیناً آپ کا ذہن اس نتیجے پر نہ پہنچے گا جس کو آپ نے اپنے خط میں پیش کیا ہے۔

تیسری بات یہ سمجھ لیجیے کہ مذہبوں، جماعتوں، تحریکوں اور اجتماعی منظم فتنوں کے معاملے کا فیصلہ ہونے میں کافی دیر لگتی ہے۔ ایک اجتماعی تحریک یا ایک منظم فتنہ کے لیے تاریخ میں سو پچاس سال کا دور بہت چھوٹی سی چیز ہوتا ہے۔ ان بڑے معاملوں میں نتائج بڑی دھیمی تدریج سے نکلتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سے فیصلے بڑا وقت لے کے صادر ہوتے ہیں۔ قرآن خود بتاتا ہے کہ تعرج الملئکۃ الیہ فی یوم کان مقدارہٗ خمسین الف سنۃ، یعنی بسا اوقات اجتماعی مسائل کی ابتدا و انتہا کے درمیان پچاس پچاس ہزار برس کا پٹیا ہوتا ہے۔ اس میدان میں اترنے والوں کے حوصلے بڑے لمبے ہونے چاہئیں۔ یہاں قانونِ مشیت یہ ہے کہ مختلف عقائد، نظریے، مسلک، مذہب، تحریکیں، تنظیمیں، فرقے، فتنے، حکومتیں، قیادتیں، اپنے پورے پورے فطری برگ و بار لانے کا موقع پائیں۔ جو جو کچھ خیر، اور جیسا جیسا کچھ شر ان کی فطرت میں مضمر ہو اسے وہ تاریخ کی کھیتی میں سنپ کر اچھی طرح اگل دیں۔ بیج سے پھل تک کا یہ سارا فاصلہ طے ہو چکتا ہے تو پھر مشیت کا باغبان یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کس درخت کو میٹھا پھل دینے کی وجہ سے باڑھ لگا کر محفوظ رکھنا ہے اور کس کو زہریلے کانٹے بکھیرنے کی وجہ سے لکڑ ہارے کے کلہاڑے کے حوالے کرنا ہے۔

اہلِ حق اور اہلِ باطل کے درمیان لمبی کشمکش ہوتی ہے اور فریقین کے حالات میں بڑے بڑے اتار

چڑھاؤ ہوتے رہتے ہیں۔ اس کشمکش کے دوران میں حالات کی کسی ایک لہر یا واقعات کی کسی ایک کروٹ کو دیکھ کر قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ بس اب آخری فیصلہ ہو گیا۔ اجلِ مسمّیٰ کے پردۂ غیب سے نمودار ہو جانے سے قبل کسی بازی کو جیتنے والے نہ جانے جان و مال کے کتنے ہی داؤں ہار چکتے ہیں تو جب کہیں جا کر کھیل کا آخری نتیجہ سامنے آتا ہے۔

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک کو مکہ کے لمبے دور میں جن دردناک آزمائشوں کا، اور محض ظاہر کو دیکھنے والی آنکھوں کے لیے "ناکامیوں" کا سامنا کرنا پڑا ہے، اگر بعد کے واقعات سے اس دور کو منقطع کر کے دیکھا جائے ــــ اور مکہ کے مخالفینِ حق کا تصورِ فہم تھا بھی یہی ــــ تو بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ جیسے بت پرست مشرکوں کے لیے کامرانی ہی کامرانی ہے اور حق پرستوں کے لیے تنگیٔ معاش ہے، مار پیٹ ہے، تذلیل و استہزاء ہے، مقاطعہ ہے، نظر بندی ہے، ہجرت ہے، قلتِ تعداد کی پریشانی ہے، اور مستقبل ہے کہ بظاہر نامعلوم ہے۔ لیکن بظاہر اس مایوس کن اور ناکامیوں بھرے ماحول کے بطن میں ایک زرّیں مستقبل پرورش پا رہا تھا کہ جب وہ نمودار ہو گیا تو ہر کوردن سے کوردن آدمی نے سمجھ لیا کہ وہ ۱۳ برس کا طویل دورِ ابتلاء سرتا سر کامیابی تھا، ناکامی کا کوئی شائبہ بھی اس میں شامل نہ تھا۔

آج بھی آپ اگر اجتماعی فضا میں حق و باطل کی کسی کشمکش کا مطالعہ فرمائیں تو پیروانِ حق کو آزمائشوں سے گزرتے، چوٹیں کھاتے اور بظاہر ان کی مساعی کے کئی ریلوں کو برباد جاتے دیکھ کر جلد بازانہ رائے قائم کرنے میں برسرِ حق نہ ہوں گے کہ بس ان لوگوں کے ساتھ سرے سے حق ہے ہی نہیں، اور ان کے حریف ہی راستی پر ہیں۔ بشری ذہن مستقبل قریب یا بعید کے ان امکانات پر حادی ہی نہیں ہو سکتا جو حالات کی کسی پلٹی کے ساتھ ظہور میں آنے والے ہیں۔

چوتھی بات یہ قابلِ ذکر ہے کہ امتِ محمدیہ کی تاریخ میں آج سے پہلے جو فتنے نمودار ہوتے رہے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنی جعلی نبوتیں اٹھیں، جتنے باطل نظریات ابھرے، جتنے گمراہ فرقے ظہور میں آئے وہ سب کے سب کچھ عرصہ کے لیے بظاہر خوب پھلے، انہوں نے پیرووں کی ایک تعداد پیدا کی، انہوں نے عارضی تنظیمی استحکام حاصل کیا، انہوں نے شاہی درباروں اور محلوں میں مقامِ اعتبار پا لیا، اور انہوں

نے اہلِ حق کو دبانے اور ستانے میں بظاہر بہت کچھ کر کے دکھایا۔ لیکن فتنے قرآن کی زبان میں شجرۂ خبیثہ ہوتے ہیں کہ جن کی ساری بہار سطحِ زمین کے اوپر ہی اوپر رہتی ہے، جڑ اندر نہیں اترتی۔ بالکل ایسے جیسے گندگی کے ایک ڈھیر پر رات ہی رات میں پدبھیڑوں کا ایک باغ لگ جاتا ہے، لیکن ناپائدار ہوتا ہے۔ چنانچہ فتنے اُبھرے اور مٹ مٹا گئے، لیکن دینِ حق کی اصل قدریں جیسے تھیں، ویسی ہی رہیں۔ مسیلمہ کذاب اور حسن بن صباح کے اٹھائے ہوئے طومار ہوں، یا مانعینِ زکوٰۃ اور نظریۂ خلقِ قرآن کے حاملین کے چھوڑے ہوئے شوشے، ان میں سے ہر ایک کچھ دیر کے لیے ضرور ایک ابھرتی ہوئی طاقت بنا ہے لیکن بہت تھوڑے دن پورے کر کے قافلۂ ایام کا غبار بن کر اڑ گیا۔

قادیانیت کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ اسے جتنا ابھرنا تھا، ابھر چکا۔ اب اس کے زوال کے آثار چشمِ بینا پر بالکل عیاں ہیں۔ اولاً یہ کہ اس کا دورِ توسیع ختم ہو چکا ہے۔ آج سے پندرہ بیس برس پہلے اس کی فتوحات کی جو رفتار تھی ـــــ خصوصاً اس کے اولیں میدان، یعنی پنجاب میں ـــــ وہ اب چوتھائی بھی نہیں رہی۔ ثانیاً اب قادیانی دعوت کے بارے میں عام فضا کچھ معلوم کرنے کی فضا نہیں ہے، بلکہ سب کچھ معلوم کر چکنے کے بعد نفرت کی فضا بن چکی ہے۔ بخلاف حق کی دعوت کے، کہ اس کے واضح ہو جانے پر جہاں مفاد پرست اشرار مخالفت اور نفرت کا ردِ عمل دکھاتے ہیں، وہاں ذہین شرفاء میں سے مسلسل ایک عنصر اس کے اصولوں اور اس کی اخلاقی قدروں کے آگے مفتوح ہوتا چلا جاتا ہے، یہاں اب صورت یہ درپیش ہے کہ چند مفاد پرست اور مخالفینِ دین (یا کم سے کم بے دین) قسم کے افراد کے علاوہ جمہورِ مسلمین قادیانیت سے فیصلہ کن حد تک بیزار ہو چکے ہیں۔ معاشرے کی رائے عام کی عدالت اب تحقیق کے مرحلے سے گذر کر فیصلہ دے رہی ہے۔ ثالثاً، قادیانی حضرات بھی اس پوزیشن کے پیدا ہوتے ہوتے اب "دعوت" پر دار و مدار رکھنے اور رائے عام کو دلائل سے فتح کرنے کے بجائے اپنی معاشی قوتوں، اپنے عہدوں اور اپنی ملازمتوں اور اپنی سازشی تدبیروں کے ساتھ عام مسلمانوں سے معرکہ لڑنے پر اتر آئے ہیں۔ اب تو قوت کی جو کچھ پونجی ان کے پاس ہے وہ اس کو ایک سوشل تصادم میں جھونک رہے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ دعوت کی کھلی کھلی ناکامی کا آغاز ہو گیا۔ معاشی دباؤ،

عہدوں کے زور اور سازشوں کے بل پر اوئی عقیدہ و مسلک انسانی قلوب کو فتح نہیں کر سکتا۔ ان طریقوں کا ردّعمل ایسے فتنوں کے لیے مہلک ہوتا ہے۔

پانچویں بات یہ بھی واضح رہنی چاہیے کہ ایک عوامی مطالبہ کو دلائل کی بجائے قوت سے دبا دینا کبھی بھی اسے ختم نہیں کر سکتا۔ ایسے مطالبوں کے نخلِ شاداب کو تشدد کی بجلیاں ایک بار ٹنڈ منڈ بنا کے رکھ دیں، تو یہ پھر اپنی کونپلیں نکال لیتے ہیں۔ افریقہ میں سفید اور رنگین نسل کی کشمکش کو دیکھ لیجیے۔ سالہا سال سے رنگین نسل کے مطالبۂ مساوات کو کچلا جا رہا ہے اور پوری پوری طاقت سے کچلا جا رہا ہے، مگر وہ ایک لحظہ کے لیے بھی نہیں مٹا۔ اسے دبانے والے بار بار دباتے ہیں لیکن وہ بار بار زور شور سے اُبھرتا ہے۔ وہ اسی طرح ابھرتا رہے گا تا آنکہ وہ حالات پر فتح پا لے۔ ایسا ہی معاملہ یہاں بھی درپیش ہے۔

سب سے آخر میں سورۃ الحاقہ کی مشہور آیات "ولو تقول علینا ۔ ۔ ۔ ۔" (۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷) کے بارے میں آپ کی اُس غلط فہمی کا ہم ازالہ کرنا چاہتے ہیں جو قادیانی مکتبِ تفسیر ہی نے پھیلائی ہے۔

پہلے ان آیات کو سامنے رکھیے:

ولو تقول علینا بعض الاقاویل لاخذنا منہ بالیمین ثم لقطعنا منہ الوتین فما منکم من احد عنہ حاجزین

اور اگر وہ (نبی صلعم) گھڑ لاتا ہم پر کوئی بات، تو ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی شاہ رگ کاٹ ڈالتے:

اب اس کے مفہوم کو سرسری طور سے کسی معاملے پر منطبق کرنے کے بجائے کسی قدر غور و فکر سے کام لیجیے۔ ایک دوسرے سے ملتی جلتی ایک جرم کی دو مختلف صورتیں ہیں کہ جن میں سے یہ ایک کی سزا ہے اور قادیانی مفسرین اسے دوسری پر چسپاں کرتے ہیں۔

ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ماسوائے انبیاء کے عام لوگ اللہ تعالیٰ کے ذمّے کوئی غلط بات لگائیں اور اُس سے یا اس کے دین سے کسی من گھڑت شے کو منسوب کریں۔ اس کی بے شمار شکلیں ہیں: کسی غلط عقیدے اور نظریے کو خدا کے دین یا الٰہی شریعت کے نام سے پیش کرنا، اپنی ذاتی رائے کو آسمانی ہدایت کی حیثیت سے سامنے لانا، خدا کی کتاب سے دانستہ ایسی بات نکال دکھانا جو اس کا

مدعا نہ ہو، اپنی مذہبی ٹھیکیداری چلانے اور دنیوی فائدے اٹھانے کے لیے غیر واجب فتوے اور احکام بالکل شارع کی طرف سے پیش کر دینا، اور از اں جملہ اپنے آپ کو یا کسی دوسرے کو خدا کی طرف سے غلط طور پر کسی خاص منصب پر مامور قرار دینا، یہ سب امور ایسے ہیں جو انبیاء سے نہیں، غیر انبیاء سے تعلق رکھتے ہیں

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ایک شخص جسے خدا نے نبوت کا ذمہ دارانہ منصب دیا ہو اور جسے اپنی ہدایت کے پہنچانے کے لیے منتخب کیا ہو، اور جس کے حرف حرف کو دنیا میں من جانب اللہ ہونے کی بنا پر سندِ قبول حاصل ہو، وہ اگر اپنے منصب میں بددیانتی دکھا کر اپنی طرف سے کچھ چیزیں خدا کے دین اور خدا کے حکم کے نام سے میدان میں لائے تو معاملہ زیادہ سنگین ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک جرم تو وہی رہتا ہے جو اوپر بیان ہوا، اور دوسرا اس سے بڑا جرم منصبِ نبوت میں بددیانتی اور دینِ حق کی امانت میں خیانت کا شامل ہو جاتا ہے۔

جرم کی پہلی صورت بہت ہی عام رہی ہے اور آج بھی ہے۔ تمام جھوٹے مذاہب، مشرکانہ عقائد، تحریف شدہ احکام و شرائع، نفس پرستانہ آراء، دنیا طلبی کے لیے لکھے ہوئے فتوے اور ان کے ساتھ ساتھ جعلی مناصب کے دعوے جو اللہ اور اس کے دین کے نام سے دنیا کے سامنے لائے جاتے رہے ہیں، اور جن سے بنی اسرائیل اور مشرکینِ عرب کی تاریخ بھری پڑی ہے جس پر خود قرآن نے نہایت وضاحت سے تبصرے کیے ہیں، بلکہ خود مسلمانوں میں بھی اس جرم کے مختلف نظائر کچھ کم موجود نہیں ہیں، یہ سب کچھ "افتراء علی اللہ" کے زیرِ عنوان داخل ہے۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ افتراء علی اللہ کی یہ ساری صورتیں عمل میں لانے والے لوگ بار بار سامنے آتے رہے، حتیٰ کہ نبوت کے جھوٹے دعوے بھی ایک بار نہیں، بار بار ہوئے، لیکن آیاتِ مذکورہ کے مطابق کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جہاں کوئی یہ جرم کرتا فوراً مشیّتِ الٰہی کا دستِ غیب حرکت میں آتا اور مجرم کے داہنے ہاتھ کو گرفت میں لے کر اس کی شاہ رگ کاٹ ڈالتا۔ افتراء علی اللہ کے مجرمین نے بڑی بڑی لمبی عمریں پائی ہیں اور بڑے بڑے لمبے دوران کے مذہبی کاروبار نے گذارے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ آیات افتراء علی اللہ کی ان عام صورتوں سے تعلق نہیں رکھتیں۔ یہ صرف دوسری صورت کے لیے ہیں کہ اگر (محض امکان مفروضہ کی حد تک) اللہ کا کوئی مامور نبی نبوت پر

فائز ہونے کے بعد اپنے منصب میں خیانت کرے تو اس کے ساتھ یہ معاملہ ہو۔ لیکن انبیاء اپنی فطرتِ سلیمہ کی وجہ سے چونکہ معصوم ہوتے ہیں، لہٰذا اس کی کوئی نظیر موجود نہیں ہے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ پھر اس سزا کو بیان کرنا بھی کیا ضرور تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سزا کے تذکرے سے مقصود اس الٰہی انتظام کے قابلِ اعتماد ہونے کو واضح کرنا ہے جس کے تحت خدا کی طرف سے اس کا دین اور اس کی ہدایت بندوں کو پہنچائی جاتی ہے، اور ان مغالطوں کو رفع کرنا ہے جو نبی کے بارے میں نبی کے مخالفین میں پائے جاتے ہیں۔

یہ پروپیگنڈہ حضرت خاتم النبیینؐ کے بارے میں مخالف حلقوں میں بہت شائع و ذائع تھا کہ "اجی کیا ہے، محض زورِ ادب ہے اور شاعرانہ حسنِ بیان!" کوئی کہتا: "اس شخص پر جن آتا ہے جو اس کے اندر سے بولتا ہے، یا ایک مجنونانہ کیفیت میں یہ ساحرانہ کلام کرنے لگتا ہے اور اسے من جانب اللہ کہہ کر پیش کرتا ہے"۔ ایک خیال یہ تھا کہ "یہ سب کہانت ہے۔ کاہن لوگ ایسی ہی فوق العام باتیں اور انوکھے نکتے بیان کیا کرتے ہیں"۔

سورۃ الحاقہ میں (اور دوسرے مقامات پر بھی) اس پروپیگنڈے کی تردید کی گئی ہے۔ فرمایا: وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ، یہ کسی شاعر کی شاعرانہ ادب طرازی نہیں ہے۔ قلیلا ما تؤمنون: تم ہی ایمان لانے میں کوتاہ ہو۔ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ: یہ کسی فال گیر کی نکتہ آرائیاں بھی نہیں ہیں۔ قلیلا ما تذکرون تم ہی استفادہ کرنے میں کوتاہ ہو! تنزیل من رب العلمین: یہ پیغام، یہ کلام، یہ نقشۂ زندگی، یہ دین، یہ قرآن تو خود رب العلمین کا اتارا ہوا ہے۔

تنزیل کا ذکر آیا تو مخاطبین کے ذہنی پس منظر کو سامنے رکھنے کی وجہ سے نظامِ تنزیل کے قابلِ اعتماد ہونے کو بھی واضح کر دیا۔ اس مقصد کے لیے اوپر یہ آیا کہ انہ لقول رسول کریم: نبی تک اسے لانے اور لفظ لفظ اسے سپرد کرنے پر ایسا قاصد مامور ہے جو "کریم" ہے، کوئی تیسرے درجے کا ناقابلِ اعتماد فرد نہیں۔ پھر آخر میں، اور زیادہ زور سے یہ بتا دیا کہ اس الٰہی قاصد سے لے کر خدا کی ہدایت کو تم تک پہنچانے والا ذریعہ اور بھی زیادہ امانت دار ہے۔ ورنہ اگر وہ اس معاملے میں ذرہ بھر بھی خیانت

کرے تو معاً اسے ہم اپنی پکڑ میں لے لیں، پھر کوئی طاقت اسے ہماری گرفت سے چھڑانے والی نہیں ہو سکتی۔ دوسری جگہ اس نظامِ تنزیل کے مزید کچھ پہلوؤں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ یعنی کسی نبی کی بعثت پر جب نزولِ وحی کا کوئی دَور شروع ہوتا ہے تو ملاءِ اعلیٰ کے چوکی پہرے کا انتظام کڑا ہو جاتا ہے پھر کاروانِ وحی اور جلوسِ الہام جن راہوں سے گزرتا ہے اُن کو شیاطین کے گذر سے پاک رکھنے کا شدید اہتمام کیا جاتا ہے۔ دینِ حق میں کسی آمیزش یا مداخلت کے امکانات بالکل ختم کر دیے جاتے ہیں۔ نبی اس سلسلہ کی آخری کڑی ہوتا ہے اور اس کے قلب و فکر کی بھی پوری پوری نگرانی و حفاظت کی جاتی ہے۔ اسی حقیقت کو ان آیات میں اجاگر کیا گیا ہے۔

قرآن میں یہ بات جس اسلوب سے کہی گئی ہے وہ انسانی زندگی میں بھی کثرت سے استعمال ہوتا ہے اور ہم سب اس کا تجربہ رکھتے ہیں۔ ایک دیانت دار تاجر اپنے مال کے بے آمیز ہونے پر یقین رکھتے ہوئے متذبذب گاہک کو اطمینان دلانے کے لیے کہتا ہے کہ اگر اس میں ملاوٹ نکلے تو ہم سارے مال کو آگ لگا دیں۔ ایک باپ جب اپنے بیٹے کی نجابت پر کامل بھروسہ رکھتا ہے تو وہ کسی شکایت کرنے والے سے یوں کہتا ہے کہ میرے بیٹے نے اگر ایسی بات کہی ہو تو میں اس کی زبان گدی سے کھینچ نہ لوں۔ ایک آقا اگر اپنے ملازم کی شرافت پر اعتماد کرتا ہے تو اس اعتماد کو دوسروں تک منتقل کرنے کے لیے وہ اس اسلوب میں بات کرتا ہے کہ اگر یہ ایک پیسے کی گڑبڑ کرے تو میں ابھی اسے کان سے پکڑ کے نکال دوں۔

نبی کے لیے ایک یہی انتباہ قرآن میں نہیں آیا، بلکہ اور مقامات پر دوسرے پہلوؤں سے بھی انتباہ موجود ہیں۔ مثلاً ایک انتباہ مشرکین اور اہلِ کتاب کی اہواء کے اتباع کے بارے میں ہے سورۂ بقرہ میں دو مقامات (آیات ۱۲۰، ۱۴۵) پر یہود و نصاریٰ کے متعلق اور سورۂ رعد میں مشرکین کے متعلق نبی صلعم کو متنبہ کر دیا گیا ہے کہ خبردار، ان کی رضا جوئی کے لیے ان کی پسند و ناپسند کے پیچھے نہ چلیے گا، ورنہ مالک من اللہ من ولی ولا نصیر (بقرہ - ۱۲۰) انک اذاً لمن الظّٰلمین (بقرہ ۱۴۵) مالک من اللہ من ولی ولا واق (رعد - ۳۷) کتنی سخت دھمکی ہے۔ یعنی خدا اور بندے کا

سارا تعلق ختم! ایسا ہی ایک انتباہ سورۃ بنی اسرائیل (آیات ۷۳، ۷۴، ۷۵) میں موجود ہے۔ یہاں ذکر ہے مشرکین کی طرف سے سمجھوتے ( COMPROMISE ) کی ایک زوردار کوشش کا۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ اگر ہم تمہیں سہارا دے کر اپنی جگہ جما نہ رکھتے تو تم کچھ نہ کچھ جھک پڑتے۔ اور اگر ایسا ہو جاتا تو؟ — تو لاذقنٰک ضعف الحیٰوۃ وضعف الممات: ہم تمہیں زندگی میں بھی عذاب کا مزہ چکھاتے اور مرنے میں بھی۔ ثم لا تجد لک علینا نصیرا: پھر ہمارے مقابلے میں تمہیں کوئی مدد کرنے والا بھی نہ ملتا۔

اب آپ دیکھیے کہ کفار اور مشرکین کی اہواء کا اتباع کرنے والے بھی غیر انبیاء میں عام ہیں اور دائرہ مذہب میں دشمنانِ حق سے سمجھوتے کرنے والوں کی بھی کثرت ہے، لیکن کسی کے ساتھ ان دھمکیوں کے مطابق نمایاں طور پر عبرتناک معاملہ نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ فوری گرفت اور فوری انقطاع علاقہ اور فوری سزا کی یہ دھمکیاں نبی کے لیے خاص ہیں۔ ممنوع یہ امور ہر غیر نبی کے لیے بھی ہیں، لیکن ان کے بارے میں یہ انتباہ خاص طور پر نبی کے لیے ہیں۔ "ولو تقول" کی دھمکی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ خدا کے بارے میں بہتان اور افترا گھڑنا جرم تو غیر نبی اور جھوٹے نبی کے لیے بھی ہے، لیکن یہاں جس گرفت سے ڈرایا گیا ہے وہ صرف سچے نبی کے لیے ہے۔

پس جو ڈھیل آپ کسی مدعی کاذب کو ملتی دیکھتے ہیں وہ تو اس آیت کی روشنی میں اس کے جھوٹا ہونے کی صریح دلیل اور علامت بنتی ہے۔

خدا کرے کہ یہ بحث آپ کے لیے اپنا ذہن صاف کرنے میں مدد دے۔

---

(بقیہ صفحہ) پہلو کا تقابل کر کے پورے سائنٹفک اسلوب سے یہ حقیقت نمایاں کر دی ہے کہ اسلام نظریہ کرسی کے مغربی تصور سے قطعی بُعد و منافات رکھتا ہے۔ اس موضوع پر درحقیقت یہ مقالہ علم و فکر کی دنیا میں ایک قابل قدر اضافہ ہے اور ہماری دلی خواہش ہے کہ تعلیم یافتہ حضرات اسے غور سے پڑھیں۔

---

# مطبوعات

**THEOCRACY & ISLAMIC STATE** از جناب پروفیسر عبدالحمید صاحب صدیقی ایم۔ اے۔ شائع کردہ مکتبۂ چراغِ راہ کراچی قیمت ۵

اسلامی تحریک دلیل کی جس قوت کے بل پر پیش قدمی کر رہی ہے اس کے خلاف ملحدانہ مغربی ذہن، مفاد پرستانہ سیرت اور دیاشانہ اطوار رکھنے والا طبقۂ مترفین سائنٹفک بنیادوں پر کوئی جوابی استدلال نہیں لا سکا۔ بس جھنجھلاہٹ میں آ آ کر کہا جاتا ہے کہ اسلامی ریاست کے نام سے تھیاکریسی قائم کی جا رہی ہے اس دعوے کے ساتھ کوئی ٹھوس استدلال سامنے نہیں آتا، کوئی علمی بحث نہیں کی جاتی۔ اسلامی ریاست کے مفہوم کا تجزیہ نہیں کیا جاتا محض دل کا بخار نکالا جاتا ہے۔ اس سے کچھ اور فائدہ ہو یا نہ ہو، اپنے ساتھ کے بہت سے عقل زدوں کو الجھن میں مبتلا رکھا جا سکتا ہے۔ درحقیقت اسلامی ریاست کے تصور کو تھیوکریسی کے لفظ سے ایک طرح کی گالی دی جاتی ہے۔

ہمارے نوجوان رفیق پروفیسر عبدالحمید صاحب نے، جو اپنی تحریروں کے ذریعے قارئین کے حلقے میں متعارف ہو چکے ہیں، اس اوچھے پروپگنڈے کی قلعی کھولنے کے لیے ایک مبسوط مقالہ لکھا جو ترجمان القرآن اور وائس آف اسلام میں شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے اور اب پمفلٹ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ یہ مقالہ مطالعہ و تحقیق پر مبنی ہے۔ اس میں ایک طرف یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلام اُس معنی میں مذہب ہے ہی نہیں، جس معنی کے ساتھ تھیوکریسی کا تصور وابستہ ہے، دوسری طرف تھیوکریسی کی ماہیت کو واضح کر کے دکھایا ہے کہ اس کے کسی پہلو کا کوئی میل اسلام کے ساتھ نہیں ہے۔ تھیوکریسی عوام پر مذہبی طبقے کی حکومت کا نام ہے لیکن اسلام میں سرے سے طبقاتی تقسیم ہوتی ہی نہیں، بلکہ اجتماعی نظام جمہور کی مساویانہ حصہ داری کے ذریعے چلتا ہے۔ تھیوکریسی کے بنیادی فلسفے کی نگاہ میں حکومت اور سیاسی نظام ایک برائی ہے جس کو انسان صبر سے بھگتنے پر مجبور ہے، لیکن اسلام خلافت اور الٰہی حکومت کو رحمت قرار دیتا ہے۔ تھیوکریسی انسانی عقل کو دباتی ہے لیکن اسلام عقل کو بیدار کرتا اور اس کی تربیت کرتا ہے تھیوکریسی عوام میں علم کے فروغ کو روکتی اور صرف حکمراں طبقے میں محدود کرتی ہے، لیکن اسلام علم کو ہر فرد تک پہنچانے کا تقاضا کرتا ہے۔ تھیوکریسی عوام کو معاشی تباہ حالی سے نکالنے کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتی۔ بخلاف اس کے اسلام معاشرے اور ریاست پر ایک ایک شہری کے معاشی استقلال کی ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ اس طرح پروفیسر صاحب نے ایک ایک (باقی ص ۹۶ پر)

# (بقیہ اشارات)

لیکن آپ نے مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا سنا کر دیکھ لیا کہ اس انتہائی مظلومی نے بھی جماعت اسلامی کو نوازن سے محروم نہیں کیا۔ نظم اور صبر اور حوصلہ جوں کا توں قائم رہا۔ پھر اب وہ کونسی ایسی افتاد یکایک آپڑی ہے کہ جو جماعت سالوں سے صبر کے اسلامی موقف پر جمی چلی آرہی ہے وہ معاً مجنونانہ وار ساری حدود کو پھاند جائے۔

ہم جماعت اسلامی کے اصولِ کار، اس کی پالیسی، اس کے مزاج اور اس کی عملی روایات کے ان چند پہلوؤں کو سامنے لا کر اربابِ اقتدار سے، سیکرٹریوں سے، انتظامی عہدہ داروں سے اور پورے تعلیم یافتہ طبقے سے یہ پوچھتے ہیں کہ کیا ایسی جماعت سے فی الواقع لا اینڈ آرڈر کو کوئی خطرہ ——— موہوم نہیں، حقیقی خطرہ ——— درپیش ہے؟

ہمارے نزدیک اصل معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ابھی یہاں ایک گروہ اسلامی دستور کے موجودہ ناقص مسودے کے خلاف بھی دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا ہے، وہ جماعت اسلامی کو عوام میں جوں جوں آگے بڑھتے دیکھتا ہے اس کا پیچ و تاب اور بڑھتا ہے، پھر جب آنے والے انتخابات کی فیصلہ کن گھڑیوں کا تصور کرتا ہے تو اور زیادہ تڑپتا ہے؛ اس کی برہمی اس بات پر اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ مولانا مودودی کو جیل میں رکھ کر اپنے جذبات کی تسکین کے لیے اس نے جن جن حیلوں بہانوں پر اپنی روش کو استوار کیا تھا، مارشل لاء کے اسیروں کی رہائی کی مہم نے پورے ملک میں ان کا تار و پود بکھیر دیا ہے۔ پھر غضب کی ایک لہر سینوں میں یہ دیکھ کر بھی اٹھتی ہے کہ ملک کی تمام اپوزیشن پارٹیاں گھٹتی ہوئی ناسازگار فضا میں ایک ایک کرکے سوکھ گئیں مگر تنہا جماعت اسلامی ہے کہ فضا کی ناسازگاریوں کے علی الرغم آگے بڑھ رہی ہے۔ ان ساری چیزوں کا مجموعی ردِ عمل ہے جو زور کرتا ہے کہ جماعت اسلامی پر جتنا بھی بس چلے، زیادتی کی جائے۔ اس زیادتی کے لیے توجیہ تیار ہو کر یہ سامنے آتی ہے کہ اس جماعت سے لا اینڈ آرڈر کو خطرہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے

کہ" پاکستان کو خطرہ ہے" اور" مفادِ عامہ کو خطرہ ہے" کی جگہ اب" لا اینڈ آرڈر کو خطرہ ہے" کا نیا نسخہ زیر تجربہ آ رہا ہے۔ غالباً یہ نسخہ تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ سے ماخوذ ہے۔

اِن دلائل کے سامنے آ جانے کے بعد اگر مسلم لیگی اقتدار اپنی موجودہ روش میں تبدیلی نہیں کرتا تو ہر زیادتی باشندگانِ ملک کی نگاہ میں کھلا کھلا ظلم قرار پائے گی۔ اور ظلم کے مقابلے میں ہمارے پاس ایک ہی جوابی طاقت ہے —— صبر!!

---

# تفہیم القرآن

## جلد دوم

### سورۃ الاعراف تا سورۃ بنی اسرائیل

تفہیم القرآن جلد دوم کی طباعت کا کام عنقریب شروع ہو جائیگا۔ مکمل ہونے پر بلا تاخیر فرمائشوں کی تعمیل اسی ترتیب سے کی جائے گی جس ترتیب سے فرمائشیں موصول ہوں گی اس لئے جلد از جلد جلد دوم کی فرمائشوں سے مطلع فرمائیں۔

---

تفہیم القرآن جلد اول طبع دوم میں حسب ذیل ہدیوں کی جلدیں موجود ہیں۔

هدیہ قسم اول ۲۰/۱۲، ۲۲/۱۲ ۲۴/۱۲ مطلا ۳۱/- ۳۳/-

هدیہ قسم دوم ۱۸/۴ ۲۰/۱۲ ۲۲/۱۲ ۲۹/- ۳۱/-

هدیہ قسم سوم ۱۱/- ۱۱/۸ ۱۲/۸ ۱۳/۴

دیگر اخراجات بذمہ خریدار

مکتبہ کی سول ایجنسیاں تفہیم القرآن براہ راست ہم سے طلب کریں

ملنے کا پتہ:

**مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان - اچھرہ لاہور**

## سود حصہ اول

ایک مدت سے یہ کتاب ختم تھی اب اسکا نیا ایڈیشن شائع ہوگیا ہے۔ سود آج کی معاشیات میں ایک نہایت اہم جز و بلکہ سنگ بنیاد کی حیثیت اختیار کرگیا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے سرمایہ داری اشتراکیت اور اسلامی نظم معیشت کا مختصر سا جائزہ لیکر اس کتاب میں ان تینوں نظریات کا اصولی فرق واضح کیا ہے اور اسلامی نظریہ معیشت کو بالتفصیل بیان کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سود کسی شکل میں بھی اس نظام معیشت میں کوئی جگہ نہیں پاسکتا اور معیشت کے ارتقاء سے جو نئے مسائل پیدا ہوگئے ہیں انہیں سود کے بغیر حل کیا جا سکتا ہے۔ علم معیشت کے طالبعلموں کے لئے ایک نہایت معلومات افزا کتاب ہے۔ قیمت تین روپے

## "سود" حصہ دوم

سود حصہ اول کے نامکمل مباحث کو مولانا مودودی نے اس کتاب میں مکمل کر دیا ہے۔ اسمیں وقت کے مختلف معاشی نظریات اور انکے تاریخی پس منظر کا پوری تفصیل سے جائزہ لینے کے بعد اس بنیادی خرابی کی نشاندھی کی گئی ہے جسکی وجہ سے یہ تمام نظرئیے انسانیت کی کوئی خدمت کرنے کے بجائے نئے مسائل اور الجھنیں پیدا کر رہے ہیں جنمیں سب سے اہم سود کا مسئلہ ہے۔ معاشیات کا تحقیقی مطالعہ کرنے والوں کے لئے سود کے موضوع پر ایک ناگزیر کتاب۔ قیمت تین روپے

## پردہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی معرکۃ الاراء تصنیف پردہ کا نیا ایڈیشن چھپ کر آ گیا ہے۔ اس جامع کتاب میں مختلف تہذیبوں کے عروج و زوال اور تاریخ تمدن کا تفصیلی جائزہ لیکر فاضل مصنف نے یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ جب کسی معاشرہ میں مردوزن کا اختلاط حدود مذہب و اخلاق کو پھاند جاتا ہے تو اسکی تباہ کاریاں کس طرح پوری قوم کو بالکل کھوکھلا اور نکما بنا کر رکھ دیتی ہیں اسلام اسی خطرہ کے سدباب کے لئے پردہ کا حصار قائم کرتا ہے۔ تفصیلات کیلئے اصل کتاب ملاحظہ فرمائیں۔

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ دیدہ زیب گرد پوش . . . . . . . . قیمت چار روپے

## اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ

شاہ ولی اللہ صاحب دھلوی کے ایک اہم رسالہ کو مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی نے نہایت شستہ اردو میں ترجمہ کیا ہے شاہ صاحب نے اپنے اس رسالے میں مختلف فقہی مذاھب کے ارتقاء اور تاریخی پس منظر کا تفصیلی جائزہ لیکر واضح کیا ہے کہ ابتداء میں یہ اختلافات کس نوعیت کے تھے اور آج ان کو کیا شکل دیدی گئی ہے نیز آپنے ان مختلف فقہی مسلکوں سے پورا فائدہ اٹھانے اور دین کو سمجھنے میں انسے مدد لینے کے لئے ایک راہ اعتدال بھی پیش کی ہے۔ قیمت ڈھائی روپے

**مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان اچھرہ - لاہور**

سرورق جدید اردو ٹائپ پریس، لاہور میں چھپا